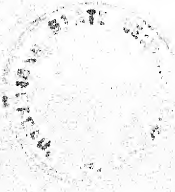
إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ

(ص ۵ - ۸۸-۸۷)

یہ تو ساری دنیا والوں کے لئے ایک نصیحت ہے اور تم لوگوں کو اس کی قدر تھوڑے دنوں بعد معلوم ہوگی

شمعِ قرآن



از

عطاء اللہ بٹالوی

بے نیازانہ ز شوریدہ نوایم مگذر
مرغِ لاہوتم و از دوست پیامے دارم

(اقبال)

قیمت

چار روپیہ

ناشر
نسیم بکڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ
فون نمبر ــــــ ۴۵۵۹

ناشر:۔ عزیز الرحمن

پرنٹر:۔ یونائٹیڈ انڈیا پریس لکھنؤ

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (حم سجدہ ۶ ۵۳/۴۱)

"ہم عنقریب اُن کو اپنی نشانیاں آفاق و انفس میں دکھائیں گے یہاں تک کہ اُن پر ظاہر ہو کے رہے گا کہ یہ قرآن "الحق" ہے"

فہرست

ملے گا منزلِ مقصود کا اُسی کو سُراغ
اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ

(اقبال)

"ارمغانِ حجاز"

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے — کھویا گیا کس طرح ترا جوہرِ ادراک؟
کس طرح ہوا کند ترا نشترِ تحقیق؟ — ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک؟
تو ظاہر و باطن کی خلافت کا سزاوار — کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلامِ خس و خاشاک؟
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں؟ — کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک؟

اب تک ہے رواں گرچہ لہو تیری رگوں میں
نے گرمئ افکار؟ نہ اندیشۂ بے باک؟

(اقبال)

"حرفِ اوّل"

چوں سرمۂ رازی رااز دیدہ فرو شستم
تقدیرِ اُمم دیدم پنہاں بہ کتاب اندر

جب ہادیٔ و رہنما "قرآن مجید" آیا تو اُس نے اپنے مخاطبین کی رہنمائی کے لئے رسول اکرمؐ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اے رسول!

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ۝ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ۝ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ ۝ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ ۝ فَذَکِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَکِّرٌ ۝ لَسْتَ عَلَیْھِمْ بِمُصَیْطِرٍ ۝ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰی وَکَفَرَ ۝ فَیُعَذِّبُہُ اللّٰہُ الْعَذَابَ الْاَکْبَرَ ۝

(غاشیہ ۱- ۱۷- ۲۴)

"کیا لوگ اونٹ پر غور نہیں کرتے کہ اُسے کس طرح پیدا کیا گیا ہے؟ اور کیا آسمان پر غور نہیں کرتے کہ انھیں کس طرح بلند کیا گیا ہے اور کیا پہاڑوں پر غور نہیں کرتے کہ انھیں کس طرح نصب کیا گیا ہے؟ اور کیا زمین پر غور نہیں کرتے کہ وہ کس طرح بچھائی گئی ہے؟ سو تم انھیں سمجھاتے رہو کیونکہ تم صرف سمجھانے والے ہی ہو بیشک تم کو اُن پر داروغہ نہیں مقرر کیا گیا ہے ہاں اُسکے بعد بھی جو روگردانی اور انکار کرے گا اُس پر اللہ کا بھاری عذاب خود ہی مسلط ہو جائے گا۔

جنابِ رسالتمآبؐ ساری عمر سمجھاتے رہے، یوں کہ آپ ہر جمعہ میں سورۂ غاشیہ پڑھا کرتے تھے۔ عربوں نے، قرآن کے اولین مخاطبین نے اُسے سُنا اور سمجھا۔ مگر اُن کے سامنے قیامِ حکومت کا مسئلہ اوّلین توجہ اور انہماک کا طالب تھا لہٰذا وہ اُس طرف متوجہ تھے البتہ استحکامِ سلطنت کے بعد اُنھیں قرآن کی رہنمائی علوم

فنون کی طرف توجہ کرنے کا موقع ملا اور وہ اس سلسلے میں غور و فکر، تلاش و تحقیق اور سعی و جہد کرنے لگے تھے۔" مار گولیتھ لکھتا ہے :-

"تحقیقِ جدید نے ہمیں اس نتیجہ پر پہنچایا ہے کہ یورپ کے علماء، نشاۃ ثانیہ سے پہلے، یونانی فلسفہ، ریاضی، فلکیات اور دیگر علوم کے متعلق جو کچھ جانتے تھے، اُن کا منبع لاطینی کتابیں تھیں اور اُن کا سرچشمہ عربی علوم تھے اور جس قوت نے عربوں کے دل میں، ان علوم کا شوق پیدا کیا وہ قرآن تھا۔"

فرانسیسی فلاسفر" الکس لوازون" لکھتا ہے :-

"ہم عیسائیوں نے عیسائیت کو علم و سائنس سے ہم آہنگ و ہمنشیں بنانے میں، ابتک جتنی کوششیں کی ہیں اسلام و قرآن میں یہ سب کچھ پہلے ہی سے موجود ہے۔"

"بریفولٹ" لکھتا ہے :-

"مغربی کلچر میں کوئی ایسا شعبہ نہیں جس میں عربی ثقافت کا رنگ نہ جھلکتا ہو۔ لیکن ایک شعبہ تو ایسا ہے جس میں یہ اثر بالکل نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اور یہی وہ شعبہ ہے جو درحقیقت عصرِ حاضر کی حقیقی قوت کا باعث اور اس کی فتوحات کا ذریعہ ہے یعنی "علم الاشیاء" سائنس کی روح[1]! ہماری سائنس

---

[1] بریفولٹ "علم الاشیاء کو سائنس کی روح" قرار دیتا ہے۔ یہ "علم الاشیاء" وہ ہے جس کی سب سے پہلے قرآن نے رہنمائی کی تھی :-

وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا — اور ہم نے آدم کو ساری چیزوں کے نام بتا دیئے یا "علم الاشیاء" عطا کیا۔

بقرہ ۴ - ۳۱

کوئی چیز جب دریافت اجزا کے بعد شناخت ہو جاتی ہے تب اس کا نام رکھا جاتا ہے۔ اس طرح تحقیق و تلاش اور تخلیق و تصنیع دونوں لازم و ملزوم ہوتی اور یہی "سائنس" ہے۔

صرف اسی حد تک عربوں کی رہین منت نہیں کہ انھوں نے ہمیں عجیب و غریب نظریات و انکشافات سے روشناس کر دیا بلکہ ہماری سائنس کا وجود ہی اُن کا شرمندۂ احسان ہے اسلام سے پہلے کی دُنیا درحقیقت زمانہ قبل از سائنس (PRE-SCIENTIFIC) تھا۔ پندرھویں صدی تک یورپ اُن ہی علوم و فنون کو اپنا تا رہا جو اُسے مسلمانوں نے دئے تھے۔ اُس پر کوئی اضافہ نہ کر سکا۔"

ڈاکٹر لیبان لکھتے ہیں:-

"ہمارے علمی مرکز وہ بڑے بڑے بے ڈھنگے قید خانے تھے جہاں ہمارے امراء ابھی نیم وحشی حالت میں رہتے اور اس پر فخر کرتے تھے کہ اُنھیں لکھنا پڑھنا نہیں آتا۔ عیسائیوں میں سب سے زیادہ باعلم وہ بیچارے جاہل راہب تھے جو اپنے وقت کو خانقاہوں کے کتب خانوں سے یونان و روم کی پُرانی تصانیف کو نکال کر اُن کو چھیلنے اور اُن چرمی ورقوں پر اپنی مہمل تصانیف مذہبی لکھنے میں صرف کرتے تھے۔ اہلِ یورپ کی وحشیانہ حالت ایک زمانۂ دراز تک ایسی شدید رہی کہ خود اُن کو اس کا احساس نہ تھا۔ جس وقت چند روشن خیال اشخاص کو اس جہالت کے کفن پھاڑنے کی ضرورت معلوم ہوئی تو انھوں نے عربوں کی طرف جو اُس زمانہ کے اساتذۂ علم و فن تھے، رجوع کیا۔ اور گربرٹ نے جو سنہ ۹۹۹ء (سنہ ۳۸۹ھ) میں سلوسٹرم کے نام سے پوپ بن گیا تھا، علم حاصل کر کے

جب اُسے اشاعت دینا چاہا تو وہ یورپ والوں کو اسقدر خلافِ حقیقت و فطرت معلوم ہوا کہ اُنھوں نے اُس پر شیطان کے مسلط ہونے کا الزام لگایا۔ اُس وقت سے پندرھویں صدی (نویں صدی ہجری) تک کسی ایسے مصنف کا حوالہ نہ دیا جاتا تھا جس نے محض عربوں سے وہ علم و فن نقل نہ کیا ہو۔"

مگر یہی مسلمان اور اُن کا قرآن اور اس قرآن کی رہنمائی کا بعد میں انداز یہ ہو گیا کہ جب یہ چیز پھر مسلمانوں کے سامنے کبھی لائی گئی اور انھیں قرآن کی رہنمائی کی طرف متوجہ کرانے کی کوشش کی گئی تو اُنھوں نے رُوگردانی کی اور تمام مسلمانوں پر حاوی و قادر جماعت نے پوری شدت سے اس امر پر اصرار کیا کہ:-

"قرآن صرف "دین" کا "رہنما" ہے۔ اس کو "دنیا" سے کیا سروکار کہ وہ دُنیاوی علوم و فنون کی رہنمائی کرے گا۔"

تا آنکہ دوسرے لوگ آہستہ آہستہ، تلاش و جستجو، تحقیق و تدقیق، سعی و کاوش اور جہد و عمل سے ان علوم پر قابض ہو گئے کیونکہ قانونِ الٰہی ہے کہ :-

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۝
(نجم ۳-۵۳ ۳۹-۴۰)

اور یہ کہ انسان کو کچھ بھی نہیں ملے گا مگر اُتنا ہی جتنا کہ وہ سعی و کاوش کرے گا اور یہ کہ ہر شخص کی محنت و مشقت ہی دیکھی جائے گی۔

نتیجتاً، مسلمانوں کی روگردانی کا، قرآن کے متذکرہ فیصلے کے مطابق کہ :-

"تم سمجھا دو کیوں کہ تمھارا کام سمجھانا ہے۔ تم کو اُن پر داروغہ نہیں مقرر کیا گیا ہے کہ زبردستی کرو۔ پھر جو رُوگردانی کرے گا

وہ تو اللہ کے بھاری عذاب میں خود ہی مبتلا ہو جائے گا"۔

ہولناک نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان نکبت و جہالت کے عذابِ اکبر میں مبتلا ہو گئے اور دوسرے جنھوں نے سعی و کاوش کی وہ شاد کام و فائز المرام ہوئے پھر یہ کچھ علم الحیوانات، علم الافلاک، علم الجبال اور علم الارض ہی کی حد تک نہ رہا بلکہ قرآن کی کسی بھی رہنمائی کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔

قرآن نے رہنمائی کی کہ رعد و برق کو عنوانِ فکر بناؤ کہ کیوں بجلی کی کوند پہلے اور رعد کی کڑک بعد میں محسوس ہوتی ہے؟ کیوں بادلوں کے ٹکرانے پر ہی بجلی کوندتی ہے؟ تم یہ نہ ڈرو کہ برق میں صرف خوف (تخریبی خطرات) ہی ہیں بلکہ اس میں اُمید (تعمیری فوائد) بھی ہیں اور عقل والوں کے لئے اس میں بڑا سبق ہے:۔

(۱) اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ (بقرہ ۲۔ ۲/۱۹)	اُن کی مثال ایسی ہے کہ جیسے بارش ہو آسمان سے اور اُس میں تاریکی اور رعد اور برق ہو"۔
(۲) هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ (رعد ۲۔ ۱۳/۱۲-۱۳)	"وہ ایسا ہے کہ تم کو بجلی دکھاتا ہے جس سے خوف اور طمع دونوں ہوتا ہے اور وہ بادلوں کو پیدا کرتا ہے جو پانی سے بھاری ہوتے ہیں اور رعد تسبیح کرتے ہیں"۔
(۳) وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ	اور اُسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تم کو خوف و امید دونوں کے لئے بجلی دکھاتا ہے اور وہی آسمان سے مینہ برساتا ہے اور پھر اس سے مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے۔ اور

يَعْقِلُوْنَ۝ — اور بیشک اُس میں اُن لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل والے ہیں۔" (روم ۳۰-۲۴)

مسلمانوں نے ہر روز کھلی آنکھوں سے وہ سب بھی دیکھا اور یہ سب بھی پڑھا مگر اُس سے روگردانی کی۔ نہ بادلوں کی ساخت و حرکت پر غور کیا نہ رعد و برق پر، نہ زمین کی موت و حیات پر کبھی سوچا اور نہ بارش کے اثرات پر۔ اور اگر کبھی کسی نے قرآن کی اس رہنمائی پر انھیں متوجہ کیا تو اُسے جواب دیا گیا کہ :-

قرآن صرف "دین" کا رہنما ہے۔ اُس کو "دنیا" سے کیا سروکار کہ وہ دنیاوی علوم و فنون کی رہنمائی کرے گا۔

تا آنکہ دوسروں نے بادلوں سے سبق حاصل کر کے بارش و بجلی کا راز دریافت کر لیا۔ اور اُن پر قابض و متصرف ہیں۔

قرآن نے اگلی قوموں کا قصہ بیان کر کے اثری اکتشافات کی طرف مسلمانوں کی رہنمائی کی نیز یہ سمجھایا کہ آثارِ علمی کی بڑی اہمیت ہے۔ کافروں سے پوچھو کہ :-

اِیْتُوْنِیْ بِکِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ — "کوئی کتاب جو اس سے پہلے کی ہو یا کوئی علمی آثار ہی میرے سامنے پیش کرو اگر تم سچے ہو؟" (احقاف ۱- ۴/۴۶)

اور بتایا کہ اگلی قوموں کے مقاماتِ رہائش، زمین کے اندر دھنسے پڑے ہیں۔ تم انھیں کھود نکالو۔

(۱) فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ۝ وَعَادًا وَّثَمُوْدَاۡ وَقَدْ تَّبَیَّنَ لَکُمْ مِّنْ مَّسٰکِنِهِمْ — "سو انھیں زلزلے نے آپکڑا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے اور عاد و ثمود بھی ہلاک ہو گئے۔ چنانچہ اُن کے گھر، تمہاری



(عنکبوت ۴ - ۲۹/۳۵-۳۸)

آنکھوں کے سامنے پڑے ہیں۔"

(۲) ثُمَّ دَمَّرْنَا الْآخَرِينَ ۝ وَإِنَّكُمْ لَتَمُرُّونَ عَلَيْهِم مُّصْبِحِينَ ۝ وَبِاللَّيْلِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝

(الصّٰفّٰت ۴ - ۳۷/۱۳۶-۱۳۸)

"پھر ہم نے اوروں کو بھی ہلاک کر دیا۔ اور تم لوگ دن کو بھی اُن کے پاس سے گزرتے رہتے ہو اور رات کو بھی، تو کیا تم کچھ بھی عقل نہیں رکھتے؟"

(۳) أَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَبْلِهِم مِّنَ الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسَاكِنِهِمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ ۖ أَفَلَا يَسْمَعُونَ ۝

(سجدہ ۳ - ۳۲/۲۶)

"کیا ان کے لئے یہ امر موجب رہنمائی نہیں کہ ہم ان سے پہلے بہتوں کو ہلاک کر چکے ہیں جن کے مقامات میں یہ چلتے پھرتے رہتے ہیں؟ بےشک، اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ کیا تم سنتے نہیں؟"

(۴) فَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَقَصْرٍ مَّشِيدٍ ۝ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا

(حج ۶ - ۲۲/۴۵-۴۶)

"پھر کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم نے اُنھیں ہلاک کر دیا اور وہ ظلم کرنے والی تھیں، وہ اس طرح اُجڑیں کہ اپنی چھتوں پر گر رہ گئیں۔ کیا لوگ زمین پر چلتے پھرتے نہیں تاکہ اُنکے دل ایسے ہو جاتے کہ وہ عقل حاصل کرتے؟"

(۵) فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝

(نمل ۴ - ۲۷/۵۲)

"سو یہ ہیں اُن کے مقامات جو اُدھڑے پڑے ہیں، اس لئے کہ اُنھوں نے ظلم کیا تھا۔ اس میں بلاشبہ عقل والوں کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔"

مگر مسلمانوں نے روگردانی کی اور جب کسی نے قرآن کی اِس رہنمائی پر

مسلمانوں کو متوجہ کرنا چاہا تو جواب دیا گیا کہ :-

"قرآن صرف "دین" کا "رہنما" ہے۔ اس کو "دنیا" سے کیا سروکار کہ وہ دنیاوی علوم و فنون کی رہنمائی کرے گا۔

تا آنکہ دوسرے لوگوں نے اثری تحقیق و انکشافات کے علوم حاصل کئے اور انھوں نے کھدائیاں کیں اور قدیم عمارتوں اور کتبوں کی برآمدگی کے ذریعہ تاریخی حقائق کی نقاب کشائی سے بڑا ہی عظیم المرتبت علمی کارنامہ پیش کیا۔

قرآن نے پیغمبروں کو ہادی اور رہنما بتایا ہے۔ اور پیغمبر زندگی کے ہر مسئلے میں رہنما ہوتا ہے۔ اسی لئے پیغمبروں کے ذکر میں صرف ایسے ہی واقعات بیان ہوئے ہیں جن میں عبرت و بصیرت اور ہدایت و رہنمائی ہو۔ چنانچہ پیغمبروں کے قصوں میں مختلف علوم و فنون کی بھی رہنمائی کی گئی۔ مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کے سلسلے میں رہنمائی کی گئی کہ تم جہاز سازی و جہاز رانی کا علم حاصل کرو اور سمندروں پر قبضہ کرسکو کہ اس کے ذریعہ تم صرف دریائی دولت مچھلی اور موتی وغیرہ ہی نہیں حاصل کرسکو گے بلکہ سمندری تجارت بھی تمھارے ہاتھ میں رہے گی :-

(۱) وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا (ہود-۴ ۱۱/۳۷)	"اور تم ہمارے حکم سے اور ہماری نگرانی میں جہاز بناؤ۔"
(۲) فَأَنجَيْنَاهُ وَأَصْحَابَ السَّفِينَةِ وَجَعَلْنَاهَا آيَةً لِّلْعَالَمِينَ ○ (عنکبوت ۲- ۲۹/۱۵)	"تو ہم نے نوح اور جہاز والوں کو طوفان سے بچا لیا اور ہم نے اسے ساری دنیا والوں کے لئے نشانی بنا دیا۔"
(۳) اللَّهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيهِ بِأَمْرِهِ	"اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لئے سمندر کو مسخر کر دیا ہے تاکہ اس میں جہاز

وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ
(جاثیہ ۲- ۱۲/۴۵)

چلیں اور تاکہ یوں تم اللہ کے فضل سے روزی تلاش کرو!!

(۴) وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ
لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا
وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً
تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ
مَوَاخِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا
مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ
(نحل ۲- ۱۴/۱۶) (فاطر ۲- ۱۲/۳۵)

"اور وہ ایسا ہے جس نے سمندر کو تمھارے لئے اس لئے مسخر کر دیا ہے تاکہ تم اپنی غذا کے لئے تروتازہ گوشت حاصل کرو اور تاکہ اس میں سے زیور کی چیزیں نکالو جنھیں پہنتے ہو۔ نیز تم دیکھتے ہو کہ جہاز سمندر میں موجوں کو چیرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں اور تاکہ تم سیر و سیاحت کے ذریعہ اللہ کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم اللہ کی ان تمام نعمتوں کے شکر گزار ہو"

سطح سمندر پر جہازوں کی روانی، اس میں مچھلیوں کی تڑپ اور قعر میں موتی و مرجان کی موجودگی کی صاف صاف رہنمائی کی گئی، مگر مسلمانوں نے ان سب سے روگردانی کی اور جب کبھی کسی نے بھی انھیں قرآن کی اس رہنمائی کی طرف متوجہ کرنا چاہا تو اُسے جواب دیا گیا کہ :-

"قرآن صرف "دین" کا رہنما ہے۔ اُسے "دُنیا" سے کیا سروکار کہ وہ دُنیاوی علوم و فنون کی رہنمائی کرے گا!"

تاآنکہ دوسرے لوگ سمندروں پر قابض ہو گئے اور جہاز سازی و جہاز رانی اُن کی خاص چیز ہو گئی آج وہ اُن سمندروں پر بھی جو مسلمانوں کے ملکوں میں ہیں، قابض و متصرف ہیں اور وہ مچھلی وغیرہ سے کروڑوں روپے کی اور موتیوں وغیرہ سے اربوں کی دولت ہر سال حاصل کر رہے ہیں بلکہ جہاز رانی ہی کے طفیل اُنھوں نے نئی نئی دُنیائیں حاصل کیں۔

قرآن نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں رہنمائی کی کہ فرعونِ موسیٰ

کی لاش، زمین میں محفوظ دبی پڑی ہے۔ انھیں معلوم تھا کہ مصر میں ہر فرعون کی لاش، بڑی بڑی دولتوں کے ساتھ مقبروں کے اندر دفن کی جاتی تھی اور قرآن کا اعلان تھا کہ فرعونِ موسیٰ کی لاش بھی محفوظ ہے۔ ڈوبتے وقت اُس سے کہدیا گیا تھا کہ:-

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ۝ (یونس ۱۰- ۹۲/۱)	"سو آج تو ہم صرف تیرے بدن ہی کو نجات دیں گے تاکہ وہ آئندہ آنے والوں کے لئے عبرت کا ذریعہ بنے اور واقعہ یہ ہے کہ بہت زیادہ لوگ میری نشانیوں سے غفلت ہی برتتے ہیں۔"

مگر مسلمانوں نے واقعی غفلت کی اور جب کبھی کسی نے قرآن کی اس رہنمائی کی طرف متوجہ کرانا چاہا تو جواب دیا گیا کہ:-

قرآن صرف "دین" کا "رہنما" ہے۔ اس کو "دنیا" سے کیا سروکار کہ وہ دنیاوی علوم و فنون کی رہنمائی کرے گا۔

تاآنکہ دوسروں نے مصر میں کھدائیاں شروع کیں اور بالآخر ۱۹۰۷ء میں وہ مقبرہ بھی نکل آیا جس میں فرعونِ موسیٰ کی لاش دفن تھی اور جنھوں نے لاش کو برآمد کیا وہ انبار کا انبار دولت، جو انھیں مقبروں میں ملی تھی، خود لے گئے اور لاش مسلمانوں کے حوالے کر گئے کہ اپنے قرآن کی صداقت میرے ذریعے دنیا سے منوایا کرو۔

قرآن نے حضرت داؤد علیہ السلام کے سلسلے میں رہنمائی کی کہ "فولاد" بڑی اہم چیز ہے۔ اِس کی صنعتوں کو حاصل کرو اور مفید مشینوں کے ساتھ ساتھ عجیب آلاتِ حرب بھی خوب بناؤ تاکہ دشمنوں پر تمھارا خوف غالب رہے اور

وہ تمھیں دبانے اور ستانے کی ہمت کبھی نہ کر سکیں۔ اور تمہارے ہی سبق کے لئے ہم نے یہ صنعت داؤد کو سکھائی تھی ۱۔

(۱) وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ... وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ (سبا ۲۔ ۱۰ - ۱۱ / ۳۴)

"اور بیشک ہم نے داؤد کو برتری بخشی تھی اپنی طرف سے ... اور اُن پر فولاد کو نرم کر دیا تھا کہ کشادہ زرہیں بناؤ اور کڑیوں کو آسانی اور مناسبت کے ساتھ جوڑو۔"

(۲) وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ○ (انبیاء ۔ ۶ ۔ ۲۱/۸۰)

"اور ہم نے تمھارے لئے، اُن کو فوجی فولادی لباس بنانا سکھایا[۱] تھا تا کہ تم جنگوں میں صدمات سے محفوظ رہ سکو۔ سو تمھیں تو شکر گذار ہونا چاہیئے۔"

(۳) وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ○ (حدید ۳ ۔ ۵۷/۲۵)

"اور ہم نے فولاد پیدا کیا کہ جس میں شدید ہیبت بھی ہے لوگوں کے لئے اور بڑے فائدے بھی۔ اور یہ اس لئے کہ اللہ معلوم کرے اُن لوگوں کو جو بے دیکھے اسکی اور اسکے رسولوں کی مدد کرتے ہیں ویسے تو خود ہی اللہ بڑا قوی اور زبردست ہے۔"

(۴) وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ

"اور جہانتک تم سے ہوسکے فولادی قوت[۲] حاصل

---

[۱] غور فرمائیے حضرت داؤدؑ کا زمانہ کب تھا اور قرآن کا نزول کب ہوا؟ مگر کہا گیا کہ ہم نے تمہارے لئے داؤد کو لوہے کا فوجی سامان بنانا سکھایا تھا۔ یعنی تو ایک طرف رہے، غیر ملکی علوم و فنون اور صنعت و حرفت کے بھی سیکھنے کا، مسلمانوں کو کیسا کھلا اشارہ ہے۔

[۲] ملکہ سبا کے درباریوں نے کہا تھا:-

نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ (نمل ۳ ۔ ۲۷/۳۳)

ہم بڑی قوت والے اور خوفناک لڑنے والے واقع ہوئے ہیں۔

مِّنْ قُوَّةٍ ۔۔ ۔۔ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ

(انفال ۸۔ $\frac{۶۰}{۴}$)

کئے رہو ۔۔ ۔۔ تاکہ اُن پر ہیبت طاری رہے جو اللہ کے اور تمھارے دشمن ہیں اور اُن پر بھی جنھیں تم لوگ نہیں جانتے مگر اللہ اُنھیں خوب جانتا ہے۔

مگر مسلمانوں نے برابر اس سے روگردانی کی اور جب کبھی کسی نے قرآن کی اس رہنمائی کی طرف متوجہ کیا یا کرانا چاہا تو اُسے جواب دیا گیا کہ :۔

قرآن صرف "دین" کا "رہنما" ہے۔ اس کو "دنیا" سے کیا سروکار کہ وہ دنیاوی علوم و فنون کی رہنمائی کرے گا۔

تا آنکہ دوسرے ساری فولادی تعمیری و تخریبی صنعتوں پر قابض ہو گئے اور اب خود مسلمان اُن کے خوف سے کانپتے رہتے ہیں۔

قرآن نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے ذکر کے سلسلے میں رہنمائی کی کہ:۔

(۱) تم ہوا پر قبضہ کرو۔

(۲) فضا کے پرندوں کی بولیاں سمجھنے کی کوشش کرو۔

(۳) پرندوں کے ذریعہ خبر رسانی سیکھو۔

(۴) زمین کے نیچے کے خزائن سے فائدہ اُٹھاؤ۔

اُس نے اعلان کیا کہ :۔

(۱) وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ

(سبا ۳۴۔ $\frac{۱۲}{۲}$)

اور ہم نے ہوا کو سلیمان کے تابع کر دیا تھا کہ اس کی محض صبح کی منزل مہینے بھر کی راہ ہوتی تھی اور شام کی منزل مہینہ بھر کی راہ ہوتی تھی اور ہم نے اس کے لئے تانبہ کا چشمہ بہا دیا تھا۔

(۲) فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ۝ (ص ۲ $\frac{۳۸}{۳۶}$)

"سو ہم نے ہوا کو اُن کے تابع کر دیا تھا کہ جہاں وہ پہنچا چاہتے، اُن کے حکم کے مطابق وہ بہ آسانی پہنچا دیتی تھی۔"

(۳) اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ۔ (نمل ۲۔ $\frac{۲۷}{۲۸}$)

"سلیمان نے ہُدہُد سے کہا کہ یہ میرا خط لے جا اور اسے لوگوں کے پاس ڈال دے۔"

(۴) وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ (نمل ۲ $\frac{۲۷}{۱۶}$)

"اور داؤد کا وارث سلیمان ہوا اور اُس نے کہا کہ اے لوگو! مجھے پرندوں کی بولیوں کا علم دیا گیا ہے۔"

مگر مسلمانوں نے ان سب سے روگردانی کی اور اگر کسی نے قرآن کی ان رہنمائیوں کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کیا تو اُسے جواب دیا گیا کہ:-

قرآن صرف "دین" کا "رہنما" ہے۔ اُسے "دُنیا" سے کیا سروکار کہ وہ دُنیاوی علوم و فنون کی رہنمائی کرے گا۔"

تا آنکہ دوسرے ہوا پر قابض ہو گئے آج اُن کے ہوائی جہاز آئے دن تیز رفتاری کا ریکارڈ توڑتے چلے جا رہے ہیں۔ مہینے مہینے بھر کی راہ صبح شام طے ہو رہی ہے۔ "ٹی۔یو ۱۰۴" نام کے روسی طیارے چھ گھنٹے میں ماسکو سے دہلی آتے جاتے ہیں اور نو بجے گھنٹے میں امریکہ کا طویل ترین سفر طے کرتے ہیں۔ یکم ستمبر ۱۹۵۸ء کے "اسٹیٹسمین" کی خبر ہے کہ دار ٹوکیو سے ٹوکیو کا سفر، برسٹل ایئرکرافٹ لمیٹڈ کمپنی کے بنائے ہوئے بری ٹینیا طیارے سے کینیڈین پاسی فک ایئرلائنز نے ۲۸ اگست ۱۹۵۸ء کو وقت کی رفتار سے بھی زیادہ تیز تر رفتار سے طے کر لیا اور برطانیہ کی کمپنی مذکور نے دعویٰ کیا ہے کہ جاپان اور کینیڈا کے درمیان کا یہ سفر (گھڑیوں کے اعتبار سے) شروع ہونے سے قبل ہی ختم ہو گیا یعنی جس تاریخ کو

ٹوکیو سے سفر شروع ہوا تھا جب طیارہ واآنکوور پہنچا ہے تو وہاں بھی وہی تاریخ تھی۔ اور یہ تاریخ میں اپنی نوعیت کی پہلی مثال ہے کہ ۴½ ہزار میل کا ہوائی سفر مغرب سے مشرق کی سمت اتنی مدت میں ختم ہوگیا جتنی مدت میں خود زمین اپنی محوری گردش پوری کرسکی۔ گویا گھڑی اور جنتری کے عام معیار سے اس سفر میں کوئی وقت ہی نہ لگا اور اگر اتوار کی صبح کو کسی وقت سفر شروع ہوا تھا تو اتوار کی صبح کو عین اُسی وقت ختم بھی ہوگیا آناً فاناً نہ صرف اتنا بلکہ انھوں نے ہوائی طاقت کے بل پر فضا سے سارے مُسلم ممالک کو دبالیا ہے۔ انھوں نے ایران، عراق، شام اور حجاز کے پٹرول کے چشموں اور سارے خزائنِ ارضی پر بھی قبضہ کرلیا ہے۔ پرندوں کے ذریعے خبررسانی اُن کا حصّہ ہوکر رہ گئی ہے۔ اور پرندوں کی بولیوں کے سمجھنے کی لاتعداد مجلسیں اُن کے یہاں قائم ہوگئی ہیں تاآنکہ وہ حروف تہجی بھی مرتب کرچکے ہیں۔

قرآن نے اسی سلسلے میں یہ بھی رہنمائی کی کہ علم کے ذریعہ چشم زدن میں مادی چیزیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوسکتی ہیں۔ ایک قصّہ بیان کیا کہ سلیمان نے ملکۂ سبا کو ہُدہُد پرندہ[1] کے ذریعہ حاضری کا خط بھیجا اور وہ سبا (عرب) سے فلسطین کی طرف چل پڑی تو سلیمان نے کہا۔

(۱) يَاۤ اَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ	"اے دربار یو! کون تم میں ایسا ہے جو قبل
بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ	اس کے کہ ملکہ فرمانبردار بن کر میرے پاس آئے

[1] بعض لوگ ہُدہُد کو پرندہ ہُدہُد نہیں مانتے بلکہ ہُدہُد نام کا کوئی انسان سمجھتے ہیں مگر قرآن خود اُسے "پرندہ" کہتا ہے لہٰذا کسی تاویل کی ضرورت نہیں:۔

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ	سلیمان نے پرندوں کا جائزہ لیا پھر کہنے لگے کہ کیا
لَاۤ اَرَى الْهُدْهُدَ (۲۷/۲۰)	سبب ہے کہ میں ہُدہُد کو نہیں دیکھتا۔

مُسْلِمِیْنَ ۝ (نمل ۲- ۲۷/۳)	اُس ملکہ کا تخت میرے پاس لے آئے؟"
(۲) قَالَ الَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ اَنَا اٰتِیْکَ بِہٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ فَلَمَّا رَاٰہُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَہٗ قَالَ ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ۔ (نمل ۲- ۲۷/۴)	"ایک شخص جس کو کتاب کا ایک علم حاصل تھا کہنے لگا کہ میں آپ کی آنکھ کے جھپکنے سے پہلے اُسے آپ کے پاس حاضر کئے دیتا ہوں چنانچہ جب سلیمان نے تخت کو اپنے سامنے رکھا دیکھا تو کہا کہ یہ میرے پروردگار کا مجھ پر خاص فضل ہے"۔

مگر مسلمانوں نے اس سے روگردانی کی اور جب قرآن کی اس رہنمائی کی طرف کسی نے مسلمانوں کو متوجہ کرنا چاہا تو جواب دیا گیا:۔

قرآن صرف "دین" کا "رہنما" ہے۔ اس کو "دُنیا" سے کیا سروکار
کہ وہ دُنیاوی علوم و فنون کی رہنمائی کرے گا۔

تا آنکہ دوسرے نہ صرف ٹیلیویژن کے علم پر قابض ہو کر تصاویر چشم زدن میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے لگے ہیں بلکہ اُنھوں نے راکٹ بھی ایجاد کر لیا اور اب چشم زدن میں وہ بھاری بھاری چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بآسانی منتقل کرنے پر بخوبی قادر ہو جائیں گے۔

غرض کہاں تک ذکر کیا جائے کہ قرآن کی رہنمائیوں اور علمی و فنی اشارات سے مسلمانوں نے کس طرح روگردانی کی اور وہ افلاس و ذلت کے عذاب اکبر میں مبتلا ہو کر رہ گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ:۔

کَیْفَ یَھْدِی اللّٰہُ قَوْمًا کَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِھِمْ وَ شَھِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّ جَآءَھُمُ الْبَیِّنٰتُ وَاللّٰہُ	"بھلا! اللہ ایسے لوگوں کی کیسے رہنمائی کرے جو کافر ہو گئے ایمان لانے کے بعد اور یہ گواہی دے چکنے کے بعد کہ رسول سچے ہیں اور بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح کتاب

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا

(آل عمران ۹- ۸۶/۳ - ۸۹)

پہنچ چکی تھی ؟ اور اللہ اپنا آپ نقصان کر لینے والوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا - اب ان لوگوں کی سزا یہ ہے کہ اُن پر اللہ کی لعنت ہو، فرشتوں کی لعنت ہو اور انسانوں کی بھی، سب کی لعنت ہو ایسے لوگ ہمیشہ اس لعنت میں گرفتار رہیں گے نہ تو ان کے عذاب میں کوئی تخفیف کی جائے گی اور نہ ان پر توجہ ہی کی جائے گی مگر ہاں اسکی ایک ہی شکل ہے کہ وہ توبہ کریں اور اس کے بعد اپنی آپ اصلاح کریں "

پہلے جو کچھ ہوا سو ہوا - مگر آج بھی حال یہ ہے کہ ہمارے یہاں زیادہ تر لوگ ایسے ہیں کہ جب کبھی کوئی ایسی تحریر و تقریر اُن کے چشم و گوش سے گذرتی ہے جس میں یہ کہا گیا ہو کہ قرآن کی رہنمائی صرف روزہ و نماز تک محدود نہیں بلکہ وہ " رہنما " ہے زندگی کے ہر مسئلہ میں ، لہذا وہ فلسفیانہ حکمتوں ، سائنسی نکتوں تاریخی بصیرتوں اور علمی گوشوں کی نشان دہی کا بھی حامل ہے اور فلاں آیت یا قصّہ کے ذریعے فلاں قسم کی علمی ، عملی ، فنّی ، سائنسی ، صنعتی اور عقلی رہنمائی ظاہر ہوتی ہے - لہذا مسلمانوں کو اِدھر توجہ کرنی چاہیئے ' تو وہ بیحد ناراض ہوتے ہیں اور یہ کہنے اور سمجھانے لگتے ہیں کہ قرآن " دین " کا " رہنما " ہے - اسکو " دُنیا " سے کیا سروکار ؟ وہ صرف عبادات و اخلاقیات کا رہنما ہے ، اُس کو علوم و فنون کی رہنمائی سے کیا تعلق ؟ حالانکہ یہ عجیب زبردستی ہے - اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند کو بھی " مُنیر " کہا ہے اور کتاب الٰہی کو بھی :-

(۱) سِرَاجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا (فرقان ۶- ۲۵/۶۱) سُورج اور چاند کو منیر بنایا "

(۲) وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ (آل عمران ۱۹-۴-۱۸۴ ، ۳۱/۲۰) " اور کتاب کو منیر بنایا "

اب اگر سورج اور چاند کی روشنی کے لئے یہ شرط نہیں کہ وہ صرف مسجد ہی کو منور کرے تو قرآن پر یہ کیسے پابندی لگائی جاسکتی ہے کہ وہ صرف مسجد ہی کو منور کرے گا؟ جب قرآن کا کام روشنی دے کر راستہ بتانا ہے۔

جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ — "ہم نے اس قرآن کو نور بنایا ہو کہ جسکے ذریعہ ہم رہنمائی کرتے ہیں۔"
(شوریٰ ۵ ۴۲/۵۲)

جس طرح ستاروں کی روشنی کا کام راستہ بتانا ہے:۔

جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا — "ہم نے تمہارے لئے ستاروں کو بنایا تاکہ تم لوگ رہنمائی حاصل کرو۔"
(انعام ۱۲- ۷/۹۸)

تو پھر کیا وجہ ہے کہ ستارہ تو اپنی رہنمائی کے لئے صرف مسجد کو وقف نہ کرے لیکن قرآن صرف مسجد کی رہنمائی کے لئے مخصوص ہو کر رہ جائے؟ اگر قرآن ہر شے کی تفصیل کرنے والا اور راستہ دکھلانے والا ہے:۔

تَفْصِیْلَ كُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً — "اور یہ ہر شے کی تفصیل کرنے والا اور رہنما و رحمت ہے۔"
(یوسف ۱۲- ۱۲/۱۱۱)

اور اگر قرآن ہر رجوع کرنے والے کے لئے عام بصیرت و نصیحت ہے اور اصرار کے ساتھ معلن ہے کہ:۔

لَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ — "ہم نے بیشک قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے۔ سو کیا ہے کوئی جو نصیحت حاصل کرنے والا[1] ہو؟"
(قمر- ۵۴)

تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ "شے" صرف وضو و تیمم ہے۔ اور قرآن صرف مسجد والوں ہی کو نصیحت کر سکتا ہے، باقی لوگ اُس سے فیضیاب نہیں

---

[1] یہ آیت سورۂ قمر کی ہے جو خود ایک منور رہتا ہے اور اُس میں یہ آیت چار بار آئی ہے۔

ہو سکتے؟ آخر "ہدایت" کے معنی کیا ہیں؟ "ہدایت" کے معنی ہیں "عمل کی راہ بتانا"۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول ہے کہ :-

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ٥ (طٰہٰ ۲- ۵۰/۲)
"ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اُس کی بناوٹ دی اور پھر اُس کو اُس کے عمل کی راہ بتائی"۔

ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ہر "شے" کی بناوٹ کے بعد اس کے عمل کی راہ اُس کو بتانے والا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ صاحبانِ علم و فن کی تخلیق کے بعد اُن کی رہنمائی کیوں نہ فرمائے گا؟ علم کی اہمیت تو ایسی ہی ہے کہ آنحضرت کو یہ دعا مانگتے رہنے کا حکم دیا گیا تھا کہ :-

قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (طٰہٰ ۶- ۱۱۴/۲)
"دعا کرو کہ اے ہمارے پروردگار! مجھے اور زیادہ علم دے"۔

اور یہ علم کچھ بحیثیت "نبی" نہیں بلکہ بہ اعتبار "بشر" حاصل کرنے کی دعا تھی کیوں کہ قرآن نے دو ایسے علم والوں کا ذکر کیا ہے جو پیغمبر نہ تھے بلکہ خود پیغمبر اُن کے علم سے مستفیض ہوتے تھے یا ہونے کے خواہاں تھے۔ ایک وہ جو حضرت سلیمان کے درباری صاحبِ علم تھے اور دوسرے وہ جن کو خضر کہا جاتا ہے۔ اس طور پر جتا دیا ہے کہ علم کا تعلق "نبوت" سے نہیں اور یہ قرآن صرف اہلِ علموں ہی کے لئے نازل ہوا ہے۔

(۱) بَلْ هُوَ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ط (عنکبوت ۵- ۴۹/۲۹)
"بلکہ یہ روشن آیتیں اُن کے سینوں کے لئے ہیں جو کہ صاحبِ علم ہیں"۔

(۲) وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا
"اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لئے بیان

لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا — کرتے ہیں اور اسے تو وہی لوگ سمجھتے ہیں
الْعَالِمُونَ (عنکبوت ۴۳-۲۹) جو اہلِ علم ہیں۔"

پھر جب قرآن کی علم نوازی اس حد تک ہے تو وہ علوم و فنون کی طرف رہنمائی سے عاجز کیسے ہو سکتا ہے؟ حضرت جمال الدین افغانی نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ:-

(۱) "ہمارے علماء نے "علم" کی دو قسمیں کر رکھی ہیں۔ ایک کو وہ "مسلمانوں کا علم" کہتے ہیں اور دوسرے کو "فرنگیوں کا"۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دوسروں کو بعض مفید علوم کی تعلیم سے منع کرتے ہیں۔ وہ اتنا نہیں سمجھتے کہ "علم" وہ شریف چیز ہے کہ جس کو کسی خاص گروہ سے نسبت نہیں دی جا سکتی۔ وہ کسی شے سے پہچانی نہیں جاتی بلکہ ہر چیز "علم" سے پہچانی جاتی ہے اور ہر مشہور گروہ "علم" ہی کی بدولت شہرت حاصل کرتا ہے۔ پس اس لئے انسانوں کو "علم" سے نسبت دینی چاہیئے نہ کہ کسی "علم" کو انسانوں سے۔ کیسی تعجب کی بات ہے کہ مسلمان جن جن "علوم" کو "ارسطو" سے منسوب کرتے ہیں اور اُن کو یہ لوگ نہایت رغبت سے پڑھتے ہیں، گویا کہ "ارسطو" بھی کوئی مسلمان مصنف تھا۔ اگر کسی چیز کو گلیلیو، نیوٹن اور کیپلر سے نسبت دی جائے تو یہ اُسے "کفر" بتلائیں گے۔ حالانکہ "علم کا ملجا و ماوا "دلیل" ہے اور "دلیل" نہ ارسطو ہے نہ گلیلیو۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اُسی جگہ دلائل پیش کریں گے جہاں "علوم و معارف" کے سیکھنے سے منع کرنا ہوتا ہے اور بزعم خود اُس کو

اسلامی دین داری اور حفاظتِ دین سے تعبیر کرتے ہیں۔
درحقیقت وہ تو اسلامی دینداری کے دشمن ہیں۔ تمام
مذاہب میں "علوم ومعارف" سے قریب تر "دین اسلام" ہے
اور "دین اسلام" کے اصولِ اساسی اور علوم ومعارف کے
درمیان کوئی مخالفت نہیں"۔ (صفحہ ۴۴)

(۲) "مسلمانوں کے یہ شایانِ شان نہیں کہ وہ فرقہ "مان بھائی"
کی طرح اپنے بلے اصل توہمات کی بنا پر موہوم خط کو سدِّ
سکندر خیال کرنے لگیں اور اس کی وجہ سے مفید علوم
کے صراطِ مستقیم اور کارآمد فنون کی راہ راست سے رُو
گرداں ہو جائیں"۔ (صفحہ ۵۸)

(۳) "مبدار اوّل وحقِ مطلق نے اپنے برگزیدہ پیغمبر صلعم کے
ذریعہ ایک "صحیفۂ گرامی" بھیجا۔ اُس صحیفۂ گرامی میں ...
جہل، غباوت، کوری، نابینائی، اپنے ظنون کی اتباع
اور اوہام کی تقلید کو، نصائح میں بُرا ٹھہرایا ہے"۔ (صفحہ ۱۲۴)

(۴) "جب اُمّتِ محمدی اُس صحیفۂ گرامی پر ایمان لے آئی تو
اُس کا جہل، علم سے، کوری، بصیرت سے، توحش، مدنیّت
سے اور بدویت، حضریت سے بدل گئی ... ...
وہ صحیفۂ گرامی مسلمانوں کے لئے پہلا "معلّمِ حکمت" تھا۔ یہی
صحیفۂ گرامی اس عالمِ کبیر کا ایسا جامع نسخہ ہے کہ ہر شخص
کے لئے اُس میں ہر طرح کے الفاظ اور کلمے موجود ہیں۔
ہر طرح کی سطریں ہیں، ہر عالمِ صغیر کے لئے صفحہ اور ہر حرکت

و تغیرّ کے لئے شرح و حاشیہ موجود ہے۔ اس کتابِ کبیر کی کوئی حد و انتہا نہیں.. .. .. اُس کے ہر کلمہ اور ہر حرف میں اس قدر رموز و اسرار پنہاں ہیں کہ اگر ماضی و حال کے تمام حکماء کو عمرِ نوح دے دی جائے اور ہر ایک ، ہر روز ، ہزار رموز حاصل کرے اور ہزار اسرار کی پردہ کشائی کرے، تب بھی یہ اُس کی کُنہ تک پہنچنے سے عاجز رہیں گے.. .. .. لہذا ہر شخص پر انفرادی طور پر اور ہر قوم پر بحیثیت مجموعی واجب ہے کہ وہ اس جامع نسخے کو کمالِ عقلی اور کمالِ معیشت کے مدارج میں، عروج کے لئے اپنے پیش نظر رکھے، اُس پر نظرِ بصیرت سے غور کرکے ہر روز ایک نیا فائدہ اور ایک نئی بات حاصل کرے۔" (صفحہ ۲)

بھلا اس میں کیا شک ہے کہ جب خود اللہ تعالیٰ اپنے کو:۔

حَكِيمٍ حَمِيدٍ (حم سجدہ ۵ - $\frac{۴۱}{۴۲}$)

حَكِيمٍ خَبِيرٍ (ہود - ۱ - $\frac{۱۱}{۱}$)

حَكِيمٌ عَلِيمٌ (انعام ۱۶ - $\frac{۶}{۱۴۰}$)

اور جب قرآن خود اپنے کو:۔

ذِكْرِ الْحَكِيمِ (آل عمران ۶ - $\frac{۳}{۵۸}$)

كِتٰبِ الْحَكِيمِ (یونس ۱ - $\frac{۱۰}{۱}$)

قُرْاٰنِ الْحَكِيمِ (یٰسین ۱ - $\frac{۳۶}{۲}$)

فرمائے اور حکمۃ نام ہو "علم و عقل کے مطابق اشیاء کی حقیقت تک پہنچنے" کا اور دعوت عام یہ ہو کہ:۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (جاثیہ ۲۔ ۴۵/۱۳)

"اور جتنی چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں ان سب کو ہم نے اپنی طرف سے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ بے شک اسمیں اسباق ہیں ان کے لئے جو غور و فکر کرنے والے ہیں"

تو پھر کیا وجہ ہے کہ قرآن "علوم و فنون" کی جانب "رہنمائی" نہ کرے گا؟ ہاں یہ البتہ ہے کہ قرآن صرف "رہنما" ہے "راہبر" نہیں، وہ علوم و فنون کی کتاب نہیں، وہ صرف راستے ہی بتا سکتا ہے، اشارے ہی کر سکتا ہے۔ وہ تفصیلات مرتب نہیں کر دے سکتا، وہ ہمارے لئے عملی طور پر کچھ کر نہیں دے سکتا۔ یہ تو میرا کام ہے کہ اُس کی رہنمائی میں، اُس کے اشارے کے مطابق ہم اُس علم و فن کو تلاش کریں، اُسے حاصل کریں اور پھر اس کے فوائد سے بہرہ مند و شادکام ہوں۔ حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کو کہا گیا تھا تو فرمایا گیا تھا کہ:۔

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا (ہود ۴۔ ۱۱/۳۷)

"اور ایک جہاز ہم ہماری نگرانی میں ہمارے حکم سے بناؤ"

اللہ تعالیٰ نے جہاز بنانے والی کوئی کتاب اُن پر نہ اُتاری تھی، نہ جبریل کو جہاز سازی کے لئے بھیجا تھا بلکہ حضرت نوح نے خود ہی سب کچھ کیا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو لوہے کی صنعت بتائی گئی تھی تو انکے لئے آسمان سے کوئی لوہے یا فولاد کا کارخانہ اُتارا نہ گیا تھا، کوئی فرشتہ انجنیئر بنا کے بھیجا نہ گیا تھا۔ بالکل اسی طرح قرآن میرا صرف رہنما ہے۔ ہادی ہے۔ ہر معاملہ میں زندگی کے ہر مسئلے میں، حیات کی ہر وادی میں، عمل کے ہر دائرے میں اور تلاش و جستجو کے ہر شعبے میں۔ مگر جس طرح کوئی رہنما ساتھ چل کر منزل تک لوگوں کو نہیں پہنچایا

کرتا اُسی طرح قرآن کا بھی کام یہ نہیں کہ وہ عملی طور پر میرے لئے کچھ کر دے۔ ایسا مطالبہ تو کوئی کافر ہی کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ:-

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ۗ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ط (الرعد - ۴ - ۳۱)

"اور اگر کوئی قرآن ایسا ہوتا جس کے ذریعے پہاڑ چل پڑتے یا اُس کے ذریعے زمین پھٹ جاتی یا مُردوں سے کلام کیا جا سکتا[۱]، تب بھی لوگ نہ مانتے۔ بلکہ یہ سب خدا کے اختیار میں ہے۔"

قرآن کا کام صرف رہنمائی کرنا ہے اور ہمارا کام جد و جہد کرنا۔ اور اگر کوئی جد و جہد کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ بھی مشکل وقتوں میں کسی نہ کسی طرح اُس کی مدد ضرور کر دیتا ہے۔ تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ جب کوئی شخص کسی اشارہ کو پا کر اُس کی تلاش کی دُھن میں لگا رہا ہے تو اُس کی مدد اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے۔

۱؎ علامہ طنطاوی مصری نے "کتاب الارواح" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں یورپ اور امریکہ کے "علم تحضیر الارواح" کی تمام کیفیتیں مفصل بیان کی ہیں۔ توریت کے "سفر سموئیل" میں بھی ذکر ہے کہ طالوت نے ایک جن کو حاضر کرنے والی عورت کے پاس جا کر سموئیل کی روح کو حاضر کرنے کا حکم دیا تھا اور وہ روح آئی تھی اور طالوت سے سوال و جواب ہوا تھا۔ ۱۸۴۸ء میں یورپ میں یہ خیال نے زور پکڑا کہ مُردوں کی روحوں کو بلا کے اُس سے بات کی جا سکتی ہے اور آج امریکہ اور یورپ کے ہر چھوٹے ملک میں اس طرح کی جماعتیں اور سوسائٹیاں قائم ہیں جو دعویدار ہیں کہ وہ مُردوں کی روحوں کو بلواتی اور اُن سے کلام کرتی ہیں۔ اس طرح یہاں "علم تحضیر الارواح" کا بڑا زور و شور ہے مگر جس چیز کو یہ حضرات "روح" کہتے ہیں وہ "جان" ہے "روح" نہیں اور "جان" ایسی چیز نہیں جو بلائی جا سکے جان کے لئے "قالب" ضروری ہے۔ لہٰذا علم تحضیر الارواح "ایک ڈھونگ" سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ چیز خواب میں تو ممکن ہے مگر بحالت بیداری کسی مُردہ ذات انسانی سے کلام کا کوئی امکان نہیں۔

یہ ازل سے ہوتا آیا ہے اور ابد تک ہوتا رہے گا۔ زمانہ ماقبلِ تاریخ کا ایک واقعہ یونانی حکیم "پلوٹارک" نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "الستیر" کی پہلی جلد میں لکھا ہے کہ "ایتھنز" کا مشہور و مقبول جنرل "تھی سی آس" "مولوسیہ" کے شہر میں انتقال کر گیا تھا اور اُس کی لاش جزیرہ "اسکائی ادس" میں کہیں پر دفن کر دی گئی تھی۔ ہزاروں برس کے بعد، جب چوتھی صدی قبلِ مسیح میں، ایتھنز کے نامور جنرل "کائمن" نے اس جزیرہ کو فتح کیا تو:۔

"نہایت خواہشمند ہوا کہ تھی، سی، ایس کی قبر کا کسی طرح سُراغ مل جائے۔ اتفاقاً ایک دن اُس نے کسی عقاب کو ایک بلند ٹیکری پر چونچیں مارتے اور پنجوں سے زمین کریدتے دیکھا۔ اُس وقت دفعتاً اُس کے دل میں یہ بات آئی، جیسے الہام ہوتا ہے کہ اسی مقام کو کھود کر تھی، سی، ایس کی لاش تلاش کی جائے۔ چنانچہ اُس جگہ ایک غیر معمولی جسامت کے آدمی کی لاش کفن میں لپٹی ہوئی ملی۔ جسکے پاس ایک تلوار اور برچھی کا پھل رکھا تھا۔ ان سب کو کائمن نے اُٹھوا کر اپنے جہاز پر رکھوا دیا اور اپنے ساتھ ایتھنز لایا"

(مشاہیر یونان و روما جلد ۱ صفحہ ۸۵)

اِس واقعہ پر غور فرمایئے جو چوتھی صدی قبلِ مسیح علیہ السلام کا ہے اور قرآن کی اِس رہنمائی پر غور فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ، جد و جہد اور تلاش و جستجو میں لگے ہوئے لوگوں کی کس طرح رہنمائی کرتا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ جب ایک بھائی نے دوسرے بھائی کو مار ڈالا اور اُس کے بعد پریشان ہونے لگا کہ لاش کو کیا کرے؟

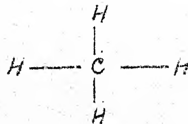
فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ "تو اللہ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کو کریدتا

فِی الْاَرْضِ لِیُرِیَہٗ کَیْفَ یُوَارِیْ سَوْاَۃَ اَخِیْہِ (مائدہ ۵ - ۳۱) تھا تاکہ اُس کو دکھا دے کہ کس طرح وہ اپنے بھائی کی لاش کو زمین میں چھپا دے۔"

پلوٹارک کا لکھا ہوا واقعہ چوتھی صدی قبلِ مسیح کا ہے اور جس مصنف نے اپنی کتاب میں اس واقعہ کو نقل کیا ہے، اُس کا سالِ وفات ۱۲۰ء کے قریب ہے، یعنی نزولِ قرآن سے تقریباً ساڑھے چار سو برس پہلے ، یہ مصنف فوت ہو چکا تھا۔ اب اِس واقعہ پر اور پھر قرآن کے بیان کردہ قصّہ اور پھر ذریعۂ رہنمائی پر غور فرمائیے کہ قرآن کس طرح رہنمائی کیا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ متلاشیوں کی کیوں کر مدد کرتا ہے؟

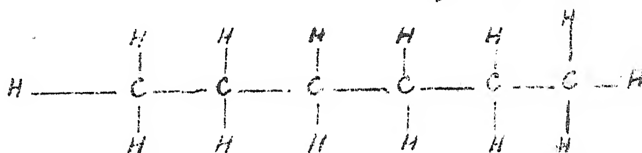
جناب محمد احمق خاں نے اپنی کتاب "پسِ منظرِ اسلام" میں صفحہ ۱۳۵ پر ایک قصّہ لکھا ہے کہ:-

"کی کولے" زندہ کیمیا (آرگے نک کیمسٹری) کے سلسلے میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ "بنزین کا گر" (فارمولا) کیا ہے؟ تجزیہ سے معلوم ہوا کہ یہ C_6H_6 ہے۔ یعنی اس میں کاربن اور ہائیڈروجن کے چھ چھ ذرّے ہیں۔ لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ کاربن کا ایک ذرہ ہمیشہ چار ذرّوں سے متّصل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسے "قوتِ اتّصال" کہتے ہیں۔ مثلاً:-



اب اگر کاربن کے چھ ذرّوں کو ہائیڈروجن کے ساتھ ملایا جائے،

تو نتیجہ یہ ہو سکتا ہے:۔



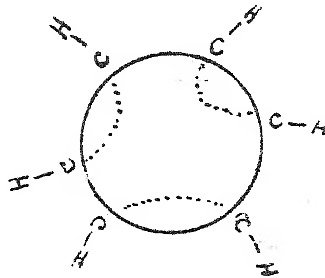
یعنی C_6H_{14} کاربن کے چھ ذرّے، ہائیڈروجن کے ۱۴ ذرّوں سے مل جاتے ہیں، لیکن اصل حقیقت یہ تھی کہ چھ ذرّے صرف چھ ذرّوں سے ملتے ہیں۔

"کی کولے" سوچ میں پڑ گیا۔ دنیا کے بڑے بڑے سائنسداں حیران تھے کہ آخر ماجرا کیا ہے؟ یہ کیوں ہے؟ آخر کار، کی کولے، اِس تلاش میں اتنا سرگرداں ہو گیا کہ لوگ اُسے خبطی یا پاگل سمجھنے لگے۔

آخر کار بہت دنوں کے بعد بلکہ مہینوں کے بعد جبکہ وہ ایک موٹر بس میں مارا مارا پھر رہا تھا اور آنکھیں بند تھیں، اُس نے دیکھا کہ ایک سانپ اپنے منھ میں اپنی دُم نگل رہا ہے یہ منظر دیکھتے ہی وہ بس سے کودا اور قریب ترین کارگاہِ سائنس میں جاکر، اُس نے سانپ کا سا حلقہ بنایا۔ کاربن کے ذرّوں کو کئی شکلوں میں، اس حلقے کے چاروں طرف لکھا اور آخر کار اُس کا گُر (فارمولا) بناکر دُنیا کے سامنے پیش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ دُنیا اِس الہام سے حیرت میں آگئی۔

جو فارمولا یا گُر بنا وہ ایسا تھا۔ بنزین کے چھ کاربن کے ذرّے صرف چھ ہی ہائیڈروجن کے ذرّوں سے ملتے تھے اور پھر بھی ہر کاربن کا ذرّہ چار سمتوں سے چار ذرّوں سے متصل تھا۔ اس طور پر

اس کی شکل یوں بنی :-



اِس گُر کے سلسلے میں جو الہامی پہلو ہے، وہی حیرت انگیز ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایسی طاقت ضرور موجود ہے جو قوانینِ قدرت کا علم (جو غیب میں ہے) صرف اُن لوگوں کو دیتی ہے جنھیں وہ پسند کرتی ہے۔"

(۱) ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ[1] مِنْ عِبَادِهٖ ؕ (انعام ۱۰- $\frac{۷}{۸۹}$)	"یہی ہے وہ رہنمائی اللہ کی، جو وہ اپنے بندوں میں سے اُس کو عطا کرتا ہے، جو بلا رہنمائی چاہتا ہے۔"
(۲) وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ (محمد ۲- $\frac{۴۷}{۱۷}$)	"اور جو لوگ راہ پر ہوئے ہیں اللہ اُن کی رہنمائی کو بڑھاتا ہی چلا جاتا ہے اور ان کو تقویٰ کی بھی توفیق عطا فرماتا ہے۔"
(۳) وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا	"اور جنھوں نے مشقت برداشت کی تو ہم ان کے کاموں کا نہایت عمدہ صلہ ضرور ہی

[1] "یَشَآءُ" کا فاعل، اس قدر دُور جا کر "اَللّٰه" کو قرار دینے کی کوئی ضرورت نہیں جبکہ بغل میں فاعل "مَنْ" موجود ہے۔

يَعۡمَلُوۡنَ (نحل ۱۳- ۱۶/۹۷) دیں گے۔"

یہ بنیادی قانون ایسا اٹل ہے کہ اس کے لئے مومن اور کافر کی مطلق قید نہیں۔ ہدایت یافتہ اور گمراہی کی کوئی تخصیص نہیں۔

مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡعَاجِلَةَ عَجَّلۡنَا لَهٗ فِيۡهَا مَا نَشَآءُ لِمَنۡ نُّرِيۡدُ ثُمَّ جَعَلۡنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصۡلٰٮهَا مَذۡمُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا ۞ وَمَنۡ اَرَادَ الۡاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعۡيَهَا وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓـئِكَ كَانَ سَعۡيُهُمۡ مَّشۡكُوۡرًا ۞ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنۡ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحۡظُوۡرًا ۞

(بنی اسرائیل ۲- ۱۸-۲۰/۱۷)

"جو شخص دنیا کا خواہشمند ہوتا ہے تو ہم ایسے شخص کو جسے چاہتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں جلد دے دیتے ہیں اور پھر اُس کے لئے جہنم مقرر کر رکھا ہے وہ اُس میں بدحال، راندہ ہو کر داخل ہوگا اور جو شخص آخرت کا خواستگار ہوگا اور جیسی محنت کرنی چاہیئے، ویسی محنت بھی کریگا اور وہ مومن بھی ہوگا تو ایسے لوگوں کی کوششیں مشکور ہوں گی۔ تمہارے پروردگار کی عطا میں سے تو یہ ہے کہ ہم اُن کی بھی مدد کرتے ہیں اور اُن کی بھی۔ اصل یہ ہو کہ تمھارے پروردگار کی عطا کسی پر بند نہیں ہے۔"

مومن کو بھی جب ہی کچھ ملے گا جب وہ بھی محنت کرے گا اور ویسی محنت جیسی کہ کرنی چاہیئے۔ یہ کبھی نہ ہوگا کہ "مومن" کو کوئی نعمت بلا سخت جہد و عمل کے محض اس لئے مل جائے گی کہ وہ مومن ہے۔ اسی طرح کسی کافر کی محنت صرف اس لئے ضائع نہیں کر دی جائے گی کہ وہ کافر ہے۔ مومن و کافر ہونے کا فائدہ آخرت سے متعلق ہوگا۔ جہاں تک کہ "دنیا" کا تعلق ہو مومن و کافر کسی کی بھی محنت ضائع نہیں کی جاتی:-

فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ "تو بلا شبہ اللہ اچھا کام کرنے والوں کی

محنت ضایع نہیں جانے دیتا۔" (ہود ۱۰ - ۱۱۵)

بہرکیف! قرآن ہر معنی میں، ہر شخص کے لئے، ہر معاملے میں "رہنما" ہے لہذا ہر انسان نہیں تو کم از کم ہر مسلمان کا تو فرض عین ہے کہ وہ قرآن کا مطالعہ اس نظر سے کرے کہ قرآن "رہنما" ہے اور پھر اس کی رہنمائی میں اپنے ذوق و وجدان کے مطابق جہد و عمل میں انہماک پیدا کرے۔

حضرت علامہ عبید الرحمٰن صاحب عاقل رحمانی پرنسپل مدرسہ احمدیہ سلفیہ (دربھنگہ۔ بہار اسٹیٹ) نے اپنے مقدمہ ترجمہ تفسیر جواہر جلد ۱ میں بالکل صحیح فرمایا ہے کہ:۔

"قرآن مجید" علوم و فنون مختلفہ، حکمت و سائنس اور فلسفۂ صحیحہ سے انسان کو روکتا نہیں بلکہ اُصولی اور اجمالی رنگ میں یہ تحریک کرتا ہے کہ ایسے علوم و فنون حاصل کئے جائیں بشرطیکہ اُن کی غلط تعلیم اور غلط تعبیر سے صحیح تہذیب اور واجبی تمدن پر کسی قسم کی زد نہ پڑے۔ آپ کو بے شمار ایسی آیتیں ملیں گی جو انسان کو پرزور الفاظ میں تمام علوم و فنون اور حکمت و فلسفہ کے حصول کی طرف توجہ دلاتی ہیں۔ اسی وجہ سے اکثر آیتوں کے خاتمہ کو یوں بیان کیا گیا۔ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ، لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ، حکمت، فلسفہ اور سائنس ہے کیا چیز؟ تدبر، تفکر اور اُن کے آثار و نتائج ہی کا تو نام ہے۔ کوئی شخص پہلے تفکر کرتا ہے، بعدازاں اُس کے نتائج کو تدبر کے زور سے عملی صورت میں پیش کر دیتا ہے جیساکہ دُنیا کی تمام انسانی مصنوعات

اس کی شاہد و دلیل ہیں۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے اکثر جگہ لفظ "حکمت" کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔"

"جب قرآن مجید ایک برہان اور نور ہے جیسا کہ فرمایا يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا (نساء ۲۴ - ۲۷/۱۷۵) تو اس کی وسعت محض نماز روزہ وغیرہ تک محدود کر دینا اور اس کی نہایت یہی قرار دینا ایک نامعقول تحدید ہے اور قرآن مجید کی ایک عالمگیر صفت تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (نحل ۱۱ - ۲۹/۸۹) کے منافی ہے اور یہ کہنا کہ لفظ حکمت، تفکر اور تدبر سے صرف دینی امور یا دینی تفکر اور دینی تدبر مراد ہے، ایک فاش اور خطرناک غلطی ہے۔ اگر صرف یہی مراد ہے تو پھر ہم کو کہنا پڑے گا کہ قرآن مجید سوائے کلمہ پڑھنے اور نماز روزہ کی تعلیم کے کچھ اور نہیں سکھاتا اور مسلمانوں کی تمام دنیاوی اور دینی ضروریات اور لوازمات کا حامل نہیں ہے۔ حالانکہ قرآن مجید کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے اور نہ ہماری عقل تسلیم کرتی ہے کہ ایک کتاب جو تمام انسانوں کی "ہدایت" کے لئے قیامت تک باقی رہے گی وہ صرف چند مذہبی احکام کی حامل ہو۔"

"جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ "نبی" سوائے "روحانیات" کے اور کوئی مشن نہیں رکھتا، وہ سخت مغالطے میں پڑے ہوئے ہیں، کیونکہ تبلیغی فرائض اور ذمہ داریاں صرف روحانیات ہی سے تعلق نہیں رکھتیں۔ کیوں کہ انسان باوجود اعلیٰ درجہ کے اتقا کے بھی دنیا سے باہر نہیں نکل سکتا اور نہ ضروریاتِ دنیا سے منہ موڑ سکتا ہے جس

طرح "روح" اور "جسم" میں وابستگی ہے، اُسی طرح "دین" اور "دُنیا" میں بھی ایک نسبت ہے۔ اگر بدن کے بغیر اس زندگی میں "روح" کام کر سکتی ہے تو "دین" بھی مادّیات کے بغیر چل سکتا ہے اور اگر "روح" بغیر بدن کے نہیں ٹھہر سکتی تو "دین" بھی مادّیات کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب دین اور دنیا باہم وابستہ ہیں تو پھر "نبی" کس طرح صرف "روحانیات" کی تعلیم دیں گے اور "مادّیات" کی تعلیم نہیں دے سکتے۔ بڑے بڑے نبیوں کی پاک زندگیاں اس پر شاہد عادل ہیں کہ انھیں "معاش" اور "معاد" دونوں سے وابستگی تھی۔"

"غرض قرآن مجید اور احادیثِ رسول بار بار پڑھو گے تو تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ کتاب سماوی اور نبی اگر ایک طرف روحانیات کا معلّم ہوتا ہے تو دوسری طرف اصولی رنگ میں امورِ معاشرت کا بھی۔ اور یہی امورِ معاشرت وہ چیزیں ہیں کہ جن میں انسان کی تمام مادّی ضروریات اور لوازمات داخل ہیں۔"

بعض اُردو مفسرین نے جو یہ بات کہی ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر میں لفظ "سمٰوٰت" یا "ارض" کے ماتحت کچھ آسمان اور زمین سے متعلق موجودہ تحقیقات کا ذکر کرنا "تفسیر بالرائے" ہے، میرے خیال میں یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ کیوں کہ جس طرح ایک روحانی مفسّر کو یہ حق ہے کہ وہ لفظ صلوٰۃ، صیام، ملائکہ، جنّت اور دوزخ کے ماتحت اُن کی پوری تفصیل کرے اور یہ تفسیر "تفسیر بالرائے" نہیں ہوتی، تو اسی طرح اُس مفسّر کو بھی جو قرآن کی تفسیر مادّی

رنگ میں کرتا ہے، یہ حق ہے کہ وہ لفظ سموات، ارض اور جبال وغیرہ کے ماتحت اُن کی کامل تشریح کرے اور یہ تشریح کسی حال میں بھی "تفسیر بالرائے" نہیں ہو سکتی۔ بلکہ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ قرآن مجید کی روحانی رنگ میں بہت زیادہ تفسیریں ہو چکی ہیں۔ اب ایسی تفسیروں کی چنداں ضرورت بھی نہیں ہے۔ اس وقت ضرورت ہے کہ قوم کو کچھ مادیات یعنی خدائی صنعتوں کی طرف توجہ دلائی جائے اسی وجہ سے قرآن نے بھی جس قدر طبعیات کے مسائل بیان کئے ہیں، اُس قدر دینی مسائل نہیں بیان کیئے۔"

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کو محض "دین کی کتاب" سمجھنے نے جتنا کچھ مسلمانوں کو نقصان پہنچایا اور جس طرح اُنھیں عرش سے فرش پر لا ڈالا اس کی داستان بڑی ہی خوفناک ہے۔ "انقلاب روس" کا مصنف "بالشویک اور وسط ایشیائی اسلامی ریاستیں" کی تمہید میں لکھتا ہے:۔

"کم فہم اور بے عمل احباب کی صحبت انسان کو بے عمل و غلط خرام بنا دیتی ہے۔ فرد کی عادات و خصائل اور اُس کے تمام اسلوب زندگی کا اندازہ اس امر سے لگایا جاتا ہے کہ اُس کی نشست و برخاست کس قسم کے افراد میں ہے ؟ خاص قسم کے احباب کی صحبت ہی کسی فرد کو متاثر نہیں کرتی بلکہ علم و ادب کی کسی خاص صنف کے مستقل مطالعہ سے بھی اُس ادب کا رنگ اور طرزِ خیال انسان پر حاوی ہو جاتا ہے۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ خواہ وہ کسی خاص فرد کی صحبت ہو یا کسی خاص نوع ادب سے اختلاط

انسان متاثر ضرور ہو جاتا ہے۔"

"اب سوال یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ لوگ جو ہر وقت قال اللہ اور قال الرسول کہتے رہتے ہیں، جن کی راتیں عبادتوں صبحیں تلاوتِ قرآن اور دن کے باقی لمحے وظائف و مراقبہ وغیرہ میں صرف ہوتے ہیں، اُن میں ایسے مضمحل تصوّرات کس طرح پیدا ہوئے جن کی وجہ سے اسلام کا بحرِ بیکراں گھٹتے گھٹتے ایک جوئے تنگ ہو کر رہ گیا؟ یہ مسئلہ سامنے آتے ہی دل کی دُنیا درد و کرب سے کانپنے لگتی ہے اور یہ شبہ گذرنے لگتا ہے کہ شاید آسمانی صحیفوں اور دیگر مذہبی کتب میں حقیقی زندگی کی وہ موجِ تیز خرام موجود ہی نہیں جس کا ذکر ہر مسلمان کی زبان پر ہے۔ گمان ہوتا ہے کہ اگر مسلمانوں کی کتابِ مقدس میں تعمیر و ترقی کی ضَو ہوتی تو اُن کی صحبت، انفرادی و اجتماعی زندگی کو ضرور جگمگا دیتی۔ جس خود ساختہ ظلمت کدہ میں اسلامی دُنیا آج سانس لے رہی ہے، اُس کو دیکھ کر یہ گمان گذرتا ہے کہ مسلمان جس کتاب کو اپنا مایۂ ناز خیال کرتے ہیں شاید وہ خود محرومِ ضیاء ہے اور اسلئے اُس سے افادہ سوائے تاریکی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔"

"لیکن تاریخ تو جھٹلائی نہیں جاسکتی، اِس تاریخی حقیقت سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دورِ رفتہ میں ایک مدت تک ضیاءِ قرآن سے معمور سینوں سے انوار و تجلیات کی وہ خنک اور روشن شعاعیں نکلتی رہیں جن سے غیر متمدن و تاریک دنیا جگمگا اُٹھی۔ مقہور اور غلام دُنیا کو خود داری، اخوتِ انسانی، مساوات اور آزادی کا پیغام دینا، اسلام کا ایک ایسا معجزہ ہے کہ تا حشر، اسلام کا یہ احسان، بنی نوع انسان کے

شانوں پر رہے گا۔

پھر اسلامی دُنیا کی تنویر سے ہٹ کر جب نظر موجودہ تاریکی پر پڑتی ہے تو طبیعت کو اِس راز کی جستجو پیدا ہوجاتی ہے کہ ایک ہی قرآن کی تعلیم سے ضیاء و ظلمت دونوں کس طرح پیدا ہوئے؟ اِس مسئلہ پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی صحیفے صرف متفکر طبیعتوں کی رہبری کرتے ہیں۔ تدبر و تفکر سے محروم فرد، مذہبی صحیفوں سے رہبری حاصل نہیں کرسکتا۔ جب مسلمانوں نے قرآن کی تعلیم اور قدرت پر غور کرنا ترک کردیا تو گویا وہ قرآن کی حقیقت ہی بھول گئے۔ قرآن، مادہ و روح، حیات و موت، حق و باطل، راحت و کلفت، قوت و سکوت، بحر و بر، کوہ و دشت، گل و خار، بہار و خزاں، برق و باراں، ماضی و حال، گرد و پیش، وحدت و کثرت اور وقت و فضا پر انسان کو غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن وہ کسی فرد کو تدبر اور تفکر کی دعوت قبول کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا۔ یہاں انسان کو خود مختاری عنایت ہوئی ہے۔ مندرجہ بالا حقائق پر سائنسداں کی طرح تدبر و تفکر کرنا انسان میں قرآن کے مطالب و معانی سمجھنے کی استعداد پیدا کرتا ہے۔ استعداد حاصل کرنے کے بعد جب انسان کسی مذہبی صحیفے کا مطالعہ کرتا ہے تب اُس کو بصیرت حاصل ہوتی ہے اور وہ نئی دُنیا تعمیر کرنے کو تیار ہوتا ہے۔ [illegible] قرآن کی تلاوت اور تدبر و تفکر سے انحراف کرنے کا یہ اثر ہوا کہ مسلمان، قرآن کی فکر و عمل کی دعوت کو، تقدیر پر صابر و شاکر رہنے کی تلقین سمجھے اور یہ غلط تخیل اُن کو ترقی سے تنزلی اور بلندی سے پستی کی طرف لے گیا۔ کتب بخاری سے [illegible]

قلب کے ساتھ، کائنات کی ہر شے مثلاً فضا، وقت، سکوت، تنہائی، دل، دماغ، روح، مادّہ وغیرہ وغیرہ پر ایک سائنسدان اور متجسّس اور حقیقت شناس فلسفی کی طرح عمیق نظر ڈالنے سے انحراف کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں نے قرآن کے سمجھنے کی اہمیت ہی کھو دی۔ اور جب کسی کتاب کے مطالب و معانی کے فہم کی اہمیت ہی فنا ہو جائے تو اُس کو بار بار دُہرانے سے کچھ فیض نہیں پہنچتا۔ مسلمانوں کا قرآن میں تدبّر و تفکّر سے اغماز و انحراف صدیوں سے آج تک قائم ہے اور اِس کا قیام زوال کے مترادف ہے۔" (صفحہ ۲۲۲ تا ۲۲۳)

اِس کے بعد "بخارا" کی حالت سے بحث کرتے ہوئے صفحہ ۲۲۶ پر لکھتا ہے:

"روس نے بخارا پر فوج کشی کر دی۔ تصوّرات کے ساتھ ساتھ اعمال و کردار اسلامی نہ ہوں تو قرآن کے کسی خاص لفظ کے بار بار دُہرانے سے تشنگی اور تدبّر و تفکّر سے اغماض کے اثرات سے مسلمان بچ نہیں سکتے۔ امیرِ بخارا نے اعلانِ جہاد بھی کیا۔ دُعائیں بھی کرائیں، اُس کی فوج بھی بہادری سے لڑی، لیکن سب بے سُود۔ روسی فوج کسی تنہا اسلامی حکومت سے کہیں زیادہ طاقتور تھی، اگر بخارا کی فوج ہی جدید جنگی آلات سے مسلح اور حربی سائنس سے آشنا ہوتی تب بھی شاید اپنے ملک کو بچا لیتی۔ لیکن امیرِ بخارا کا لفظ "جہاد" پر اصرار تھا اور لفظ "جہاد" جادو نہیں کہ شیخ الاسلام کی زبان سے اِس لفظ کے نکلتے ہی آسمان سے فرشتوں کی فوج اُتر آئے۔ جنگِ اُحد میں تدابیر سے لاپروائی اور حرص و طمع سے ہم آغوشی، باوجود پیغمبر کی موجودگی کے مسلمانوں کی شکستِ فاش کا سبب بنی۔ جذبہ، درود

کی مدد پر، جب تک مادی حالات نہ ہوں، اُس وقت تک زندگی کے کسی معرکے میں فتح ہونی غیر ممکن ہوتی ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن پر ایمان رکھنے، اُس کو رہنما تسلیم کرنے اور اُسکی روزانہ تلاوت کرنے کے بعد بھی، اُسے دُنیاوی علوم و فنون کی رہنمائی سے عاجز ماننا، اُس میں غور و فکر کی ضرورت نہ سمجھنا اور جب کوئی قرآن کی اِس خصوصیت کی طرف نشاندہی کرے تو اُس سے روگردانی کرنا، اتنی بڑی بدنصیبی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو سزا بھی ہم مسلمانوں کو نہ ملے وہ کم ہے:۔

وَكَأَيِّن مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ ۝ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُم بِاللَّهِ إِلَّا وَهُم مُّشْرِكُونَ ۝ أَفَأَمِنُوا أَن تَأْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللَّهِ

(یوسف ۱۲ - ۱۰۵-۱۰۶)

"اور آسمانوں اور زمین میں بہت سی نشانیاں ایسی ہیں جن پر اُن کا گذر رہتا رہتا ہے اور اس کے باوجود وہ اُنسے روگردانی کرتے ہیں، اور اُن میں اکثر وہی ہیں جو اللہ کو مانتے بھی ہیں مگر یوں کہ وہ شرک بھی کرتے ہیں۔ تو یہ کیا بالکل ہی اس بات سے مطمئن ہو بیٹھے ہیں کہ اُن پر اللہ کا عذاب نازل ہو جائے اور اُنھیں ڈھانپ لے"۔

کیوں نہ ایسا ہو جبکہ صورتِ حال یہ ہے کہ:۔

"دُنیا کی کوئی دوسری کتاب ایسی نہیں جس نے اپنے پڑھنے والوں کو، اپنے مضامین پر غور کرنے کی اتنی تاکید کی ہو جتنی تاکید قرآن پاک نے اپنے پڑھنے والوں سے کی۔ قرآن نے بار بار تقاضا کیا کہ اُس کے مضامین پر غور کیا جائے۔ اُس کے معنی خوب سوچ سمجھ کر معلوم کئے جائیں اور اُس کی بتائی ہوئی باتوں پر پورا پورا دھیان دیا جائے

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شاید ہی دُنیا کی کوئی دوسری کتاب ایسی
ہو جسے بلا سوچے سمجھے اِتنا پڑھا گیا ہو جتنا کہ قرآن کو پڑھا جاتا ہے۔
اور قرآن پر یہ ظلم خود قرآن کے ماننے والوں نے کیا ہے"!
(قرآن نمبر رسالہ الحسنات صفحہ ۱۳۴)

بہرکیف! اِن تمام تذکروں اور مباحثوں کا حاصل صرف یہ عرض کرنا ہے کہ قرآن جو مسلمانوں کی دُنیاوی زندگی کا رہنما بن کر ہر شخص کے لئے آیا ہے اُس کو صرف دین سے وابستہ کرنا اور یہ سمجھنا کہ اُس کو دُنیا، دُنیا کے علوم وفنون اور دنیاوی راستوں سے کوئی سروکار ہی نہیں، سراسر بے بنیاد ہے، قطعی باطل ہے، بالکل ہی غلط ہے بلکہ قرآن دُنیاوی دستور العمل بن کر آیا ہے اس لئے وہ سارے دُنیاوی معاملات و مسائل میں رہنمائی کرتا ہے اور اُس کا ہر ہر لفظ مستقل دعوتِ عمل ہے۔ قرآن نے نسلِ انسانی کو "شجرہ"[1] یعنی درخت کا سا سلسلہ رکھنے سے تعبیر کیا ہے جس طرح ہر درخت کی بہت سی شاخیں، ٹہنیاں اور پھل پھول، پتّے ہوتے ہیں اسی طرح ہر فردِ انسانی کا خاندانی سلسلہ ہوتا ہے۔ جس طرح اُس کے بیج سے دوسرے بہت سے درخت پیدا ہوتے ہیں، اُسی طرح ہر فردِ انسانی سے مختلف خاندان ظہور میں آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی پیدائش کو بھی نباتات کی پیدائش سے مماثل بنایا گیا ہے، کہا گیا ہے کہ وَاللّٰہُ اَنۡۢبَتَکُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ نَبَاتًا (نوح ۱- ۱۷) "اور اللہ نے تمہیں زمین سے اُگایا ہے ایک طرح کا اُگانا"۔ آپ نے کبھی اِس نکتے پر غور فرمایا ہے کہ انسان اور درخت کی مماثل پیدائش میں کیا نکتہ ہے؟ درخت مستقل سعی و

---

[1] آدم کے قصہ میں "شجرہ" کا کیا مطلب ہے؟ اس کے شافی و مفصل جواب کے لئے آپ چاہیں تو "انوارِ تفکر" شائع کردہ سنگم بال سبھا جامعہ نگر- نئی دہلی ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

تلاش اور سرتاسر جہد و عمل ہوتا ہے۔ فرش سے عرش تک۔ ثری سے ثریا تک۔ ایک طرف اُس کی جڑیں، زمین میں دھنس کر، اُس کے راز کی تلاش میں اُس کا کلیجہ چیرتی چلی جاتی ہیں، اور دوسری جانب عملی جدّ و جہد میں اُسکی شاخیں آسمانوں کو ناپ ڈالنے کے لئے اوپر اُٹھتی چلی جاتی ہیں۔ ہر درخت آسمانوں اور زمین کو اپنی مٹھی میں لے لینا چاہتا ہے یہ مسلمانوں کے لئے ایک نکتہ تھا کہ انسان، درخت کا سا ہے لہٰذا وہ بھی درخت کی طرح آسمانوں اور زمین پر قبضہ جمالے۔ زمین کا سینہ چیر ڈالے اور آسمانوں کو ناپ ڈالے"۔

قرآن نے "شہد کی مکھی" کا ذکر کیا ہے۔ کیا آپ نے اِس نکتے پر کبھی فکر کیا ہے۔ کیا کبھی سوچا کہ اِس کا ذکر کیوں ہوا ہے؟

وَاَوْحیٰ رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ (نحل ۹۔ ۶۸)	"اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کو وحی کیا کہ پہاڑوں، درختوں اور چھپّروں میں گھر بنا"

شہد کی مکھیوں کے نظم و ضبط، انتظام و انصرام اور شہد کے فضائل و مناقب سے قطع نظر، سب سے بڑا نکتہ مسلمانوں کو یہ بتایا گیا تھا کہ شہد کی مکھی جہد و عمل میں اپنا جواب نہیں رکھتی، کبوتر، چیل، گدھ اور شہباز وغیرہ فضاؤں میں روزانہ سیکڑوں میل کا سفر طے کرتے ہیں۔ شارک اور دوسری مچھلیاں بھی سمندروں کی پہنائیوں میں بہت لمبی لمبی دوڑ لگاتی ہیں مگر شہد کی مکھی کا کوئی بھی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ وہ آدھا پونڈ شہد کے لئے رس حاصل کرنے کو مجموعی طور پر جس قدر طویل پرواز کرتی ہے وہ کرۂ ارض کے گرد ۲ دو مرتبہ چکر لگانے کے برابر ہوتی ہے۔ غور تو فرمائیے کہ قرآن نے جہد و عمل اور سعی و تلاش کے کیسے کیسے

نفیس نکتے ہم مسلمانوں کو عطا کئے ہیں ؟ اور پھر اس کے بعد یہ بشارت کہ:

(۱) سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً (لقمٰن ۲۰ - ۲۱)

"اللہ نے تم لوگوں کے لئے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب کو مسخر کر دیا ہے اور اپنی تمام ظاہری و باطنی نعمتیں تم پر پوری کر دی ہیں۔"

(۲) خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ (الجاثیہ ۲۲ - ۲۵)

"اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے تاکہ ہر شخص کو اس کے عمل کا بدلہ دے۔"

بہر کیف زیر نظر کتاب میرے دو مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف موضوعات پر مختلف وقتوں میں لکھے گئے ہیں۔ یہ دونوں مضامین مع ضمنی مباحث کے اہم علمی موضوعات سے متعلق ہیں، اس لئے لامحالہ ان کے مطالعہ کے وقت شعریت و ادبیت کا لطف آپ کو محسوس نہ ہوگا اور ہر چند کہ میں نے انداز و الفاظ میں اس امر کی کوشش کی ہے کہ خشکی اور یبوست پیدا نہ ہو مگر اسکے باوجود اس کی اہمیت و علمیت آپ سے دماغ پر زور ڈالنے کا ضرور مطالبہ کرے گی لہٰذا جب اس کتاب کا مطالعہ کیجئے تو اکتائیے نہیں بلکہ صبر و ضبط اور انہماک و توجہ کے ساتھ غائر فکر و نظر سے اس کا مطالعہ کیجئے۔ یہ کتاب بڑے بڑے غور طلب اہم حقائق، نئے نئے عنوانات فکر اور طرح طرح کے موضوعات تحقیق آپ کے سامنے پیش کرے گی اور اگر آپ یقین کریں تو میں عرض کروں گا کہ یہ کتاب بعض ایسے نقاط و نکات کی حامل ہے جو اس سے پہلے آپ کے سامنے نہیں آئے یا جو آئے ہیں وہ اس کتاب کی روشنی میں نئے سرے سے تحقیق طلب اور محتاج فکر ہیں۔

ہرگز میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میری رائے قطعی ہے مگر یہ ضرور عرض کرونگا کہ میں نے حتی الامکان بہت غور و فکر کے بعد اپنی رائے پیش کی ہے۔ چونکہ ہر حقیقت و اصلیت کو تین منزلوں سے یقیناً گذرنا پڑتا ہے۔ یعنی لوگوں کے سامنے جب کوئی نئی بات پیش ہوتی ہے تو پہلے بڑی بے دردی کے ساتھ وہ اس کا مضحکہ اُڑاتے ہیں۔ پھر وہ منزل آتی ہے جب وہ ہوش ہو جانے اور واقعی سوچنے لگتے ہیں اور اس کے بعد وہ منزل آتی ہے جب اس حقیقت کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ لہذا میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کا ہر مقالہ آپکو ایک نئی راہ پر ڈالتا ہے گا جس سے آپ کترائیں گے۔ تاہم میں اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر آپ کو اختلاف ہو تو آپ مضحکہ خیز انداز میں آتش زیر پانہ ہو جائیں بلکہ سنجیدگی و اطمینان سے قرآن کی روشنی میں غور کریں۔ اِس سے فائدہ یہ ہوگا کہ اگر میں نے صحیح رائے قائم کرنے میں غلطی کی ہے تو آپکے ذریعہ صحیح رائے لوگوں کے سامنے آجائے گی۔ یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کو خواہ مخواہ اختلاف نہ ہو بلکہ آپ کے اختلاف کی پشت پر کوئی ٹھوس قرآنی شہادت یا علمی بصیرت ہو تو آپ میرے پیچھے پڑنے کے بجائے اُس موضوع کے پیچھے پڑیں تاکہ لوگوں کو اس سے فائدہ ہو۔ میرا مقصد اپنی رائے کی اہمیت جتانا نہیں بلکہ مسلمان عالموں، سائنسدانوں، محققوں، ڈاکٹروں اور ریسرچ اسکالروں کو اِس طرف متوجہ کرنا ہے کہ قرآن ہمارا ہر معاملے میں "رہنما" ہے، لہذا اس کا مطالعہ نہایت انہماک سے کیا جائے اور اُس کی رہنمائی سے جو عنوانات فکر سامنے آئیں اُن پر تحقیق و تلاش میں وقت صرف کیا جائے۔ میں نے پچھلے اوراق میں صرف سمجھنے اور دیکھنے کیلئے چند ایسی چیزوں کی رہنمائی کی طرف اشارہ کیا ہے جن کی صحت اب مشکوک

نہیں اور اہلِ کتاب میں جو مقالے پیش کئے ہیں اُن میں کے بعض پہلو پایۂ ثبوت کو پہنچ چکے اور بعض تحقیق طلب ہیں یہ اس لئے کہ مسلمان تحقیق و تلاش کا کام قرآن سے بھی لے لیں اُن میں قرآنی رہنمائیوں کی طرف غور و فکر کی توجہ ہو۔ اور وہ یہ دیکھیں اور سمجھیں کہ قرآن واقعی ہر معاملے میں رہنمائی کرتا ہے۔ بس

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ قرآن کے کسی مسئلہ میں اختلافِ رائے یا قدیم خیال پر از سرِ نو فکر سے "ایمان" زوال میں پڑ جائے گا۔ حالانکہ قرآن نے نہایت واضح طور پر بتا دیا ہے کہ "ایمان" کا تعلق صرف پانچ چیزوں سے ہے جو ان پر ایمان رکھے گا وہ "مومن" کہلائے گا اور جو اُن پر ایمان نہ رکھے گا وہ "کافر" ہوگا۔

(۱) اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ
(البقرہ ۲۲ - ۲/۱۷۷)

"ایمان لائے اللہ پر اور یومِ آخر پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور نبیوں پر"

(۲) وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا ۝
(النساء ۲۰ - ۴/۱۳۶)

"اور جو انکار کرے اللہ کا اور اُس کے فرشتوں کا اور اُس کی کتابوں کا اور اُس کے رسولوں کا اور یومِ آخرت کا تو وہ شخص گمراہی میں بڑی دور جا پڑا"

اِن کے علاوہ قرآن کی اور کوئی چیز ایسی نہیں، جس پر آپ بحث کریں کیا معنی کہ اگر اس پر ایمان بھی نہ رکھیں تو بھی آپ کے "ایمان" میں کوئی نقص واقع ہو۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر یہ ایمان رکھنا لازمی ہے کہ وہ خدا کے برگزیدہ نبی تھے، اس لئے کہ نبیوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس کے بعد اگر آپ یہ مانیں کہ وہ بے باپ کے پیدا ہوئے، خواہ یہ نہ مانیں یا اُن کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بارے میں یہ مانیں کہ وہ اٹھائے گئے یا یہ نہ مانیں، اس کو آپ کے

ایمان پر کوئی زد نہ پڑے گی۔ قرآن نے اس پر ایمان لانے کا مطالبہ نہیں کیا ہے بلکہ اس مسئلہ کو علمی و تحقیقی بنا کے بحث و تلاش کے لئے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ لہٰذا جو موضوعاتِ فکر، اس کتاب میں پیش ہوئے ہیں، ان پر غور کرنے یا انہیں تحقیق و تلاش کرنے کے سلسلے میں آپ یہ اندیشہ نہ فرمائیں کہ اس سے ایمان زوال میں پڑ جائے گا۔

یہ بھی سمجھایا جاتا ہے کہ قرآن عربی زبان جانے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ بھلا یہ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ قرآن جو الفرقان اور ذکر للعالمین بن کر آیا ہے حالانکہ عربی زبان صرف تھوڑے سے انسانوں کی زبان ہے؟ اگر عربی زبان جانے ہی پر قرآن کا سمجھنا ممکن ہوتا تو قرآن قیامت تک کے لئے اور ہر فردِ بشر کے لئے کس طرح رہنمائی کرتا؟ کیا قرآن سے فائدہ اٹھانے کے لئے دنیا کے ہر انسان کو عربی زبان سیکھنی پڑے گی؟ اگر عربی زبان جاننے ہی پر قرآن فہمی کا انحصار ہوتا تو ابوجہل اور ابولہب بھی قرآن ضرور سمجھ جاتے۔ یہ درست ہے کہ عربی زبان جاننے سے قرآن کا لسانی لطف بھی لے سکتا اس لئے کہ کسی زبان کی لسانی خوبی ترجمہ میں منتقل نہیں ہوسکتی مگر یہ بالکل غلط ہے کہ قرآن عربی زبان جانے بغیر سمجھا ہی نہیں جاسکتا۔ اگر قرآن ترجمہ سے قرار واقعی اور بخوبی نہیں سمجھا جاسکتا تو قرآن کو، جو عربی زبان میں ہے، ساری دنیا والوں کے لئے ذریعہ ہدایت ہرگز نہ بنایا جاتا جبکہ دنیا میں اس وقت کم و بیش چار ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں؟ یوں بھی سوچیے کہ اگر توریت و انجیل ترجمہ سے بھی بخوبی سمجھی جاسکتی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ قرآن ترجمہ سے پوری طرح نہ سمجھا جاسکے؟ اور اگر قرآن ترجمہ سے سمجھا ہی نہیں جاسکتا تو لوگوں نے دوسری زبانوں میں اس کے لاتعداد ترجمے کیوں کئے؟ اور قرآن ان لوگوں تک پہنچانے کی کیا سبیل ہوگی جن کی

زبان عربی نہیں ہے؟ نہ صرف اتنا بلکہ جب قرآن کا خود بہت بڑا حصہ اصل نہیں بلکہ ترجمہ ہے تو کیا وجہ ہے کہ جب تیسری چوتھی زبان میں وہ منتقل ہو تو سمجھا نہ جا سکے؟ آدم سے عیسیٰ تک کی جتنی گذری باتیں قرآن میں بیان ہوئی ہیں یا قیامت کے بعد کی ساری گفتگو ئیں سب کی سب ترجمہ اور صرف ترجمہ ہیں سوچیے تو کہ آدم، ابلیس، ملائکہ اور اللہ تعالیٰ کی وہ ساری گفتگو جو قرآن میں مذکور ہے کیا عربی زبان میں ہوئی تھی؟ وہ ساری باتیں جب عبرانیوں کو سُنائی گئی تھیں تو عبرانی زبان میں ترجمہ کر کے سُنائی گئی تھیں اور جب عربوں کو سنائی گئیں تو عربی زبان میں ترجمہ کر کے سُنائی گئیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ وہی باتیں جب کسی اور زبان میں ترجمہ ہوں تو سمجھی نہ جا سکیں؟ قرآن کا یہ انداز بجائے خود اس بات کا مظہر و معلن ہے کہ جب جس کو جو بات کہنی ہو، وہ بات اُس کی زبان میں ترجمہ کر کے کہی اور سُنائی جائے۔ لہٰذا یہ قطعی غلط پروپیگنڈا ہے کہ قرآن ترجمہ سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ آپ قرآن کو ترجمہ کے ساتھ بہ اطمینان پڑھیئے اور سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ قرآن فہمی کا مدار عربی دانی پر نہیں بلکہ غور و فکر اور تلاش و جستجو پر ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن ترجمہ سے نہیں سمجھا جا سکتا اُنکے پاس کوئی دلیل نہیں اور قرآن کا حکم ہے کہ مرد، جیو تک دلیل سے :-

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ	"تاکہ جو ہلاک ہو وہ دلیل سے ہلاک
وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ	ہو اور جو جیتا رہے وہ بھی دلیل سے
(انفال ۵ - ۴۲)	جیئے"

پھر کیا دلیل ہے کہ قرآن ترجمہ سے نہیں سمجھا جا سکتا؟ قرآن کی زبان عربی ہے مگر یہ کوئی خدائی زبان تو ہے نہیں، اور نہ دوسری زبانیں شیطان کی زبانیں ہیں؟ جتنی زبانیں بھی ہیں سب کی سب انسانوں ہی کی زبانیں اور اللہ ہی کی

پیدا کی ہوئی ہیں :-

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ	"اور یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے
وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ	آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور تمھاری زبانوں
وَاَلْوَانِکُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ	اور تمہاری رنگتوں کا جدا ہونا۔ اس میں اہل
لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ (روم ۲-۲۲/۳۰)	علموں کے لئے نشانیاں ہیں"

پھر کیا وجہ ہے کہ ایک بات جو عربی یا عبرانی زبان میں ہو وہ انگریزی یا اردو زبان میں سمجھی نہ جا سکے؟ پھر قرآن کے جتنے ترجمے ہیں وہ تو زبان دانوں ہی کے کئے ہوئے ہیں۔ اس صورت میں ترجموں سے قرآن نہ سمجھنا کیا معنی؟

ہاں ایک بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ قرآن کی تلاوت بغیر اصل متن یعنی عربی عبارت کے محض ترجمہ کے ذریعہ کسی طرح بھی درست نہیں آجکل قرآن کا بعض ترجمہ، بلا اصل متن کے چھپ رہا ہے۔ یہ بالکل غلط طریقہ ہے۔ قرآن نے "تلاوت" کے لئے "آیاتِ الٰہی" کی ہر جگہ شرط لگائی ہے:-

(۱) وَاتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ	"اور تم تلاوت کرو اُس وحی کی جو تم پر تمہارے
کِتَابِ رَبِّکَ (کہف ۴-۲۷/۱۸ و ۲۹/۴۵ عنکبوت)	پروردگار کی طرف سے کتاب میں ہوئی ہے"
(۲) وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْھِمْ اٰیٰتُنَا	"اور جب اُن کے سامنے ہماری واضح
بَیِّنٰتٍ (یونس ۲-۱۵/۱۰)	آیات تلاوت کی جاتی ہیں"
(۳) لِتَتْلُوَا عَلَیْھِمُ الَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ	"تاکہ ان پر تلاوت کرے وہ جو ہم نے
اِلَیْکَ (رعد ۴- ۳۰/۱۳)	تجھ پر وحی کیا ہے"

اب محض ترجمہ پڑھنا "تلاوت" نہ کہلائے گا کیوں کہ "تلاوت" کے لئے کتاب "آیات" اور "وحی" کی شرط ہے اور ترجمہ "وحی" نہیں۔ لہٰذا اصل متنِ قرآن کی تلاوت ضروری ہے۔ نیز توریت و انجیل کی تحریف کا واحد سبب یہی تھا اور ہوا

کہ اُن کتابوں کے "اصل متن" اور "وحیِ الٰہی کے الفاظ" کو ہٹا کے صرف ترجمہ رکھا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ مترجم کے الفاظ کو وحیِ الٰہی اور الفاظِ خداوندی سمجھنے لگے۔ حالانکہ ترجمہ کتنا ہی صحیح، بہتر اور درست کیوں نہ ہو، تلاوت، غور و فکر، تلاش و جستجو اور صحیح مفہوم و مطالب تک پہنچنے کے لئے الفاظِ وحی اور اصلِ متن کا قاریِ قرآن کے سامنے رہنا قطعی ضروری ہے کیوں کہ ترجمہ پھر ترجمہ ہے وہ اصل نہیں ہو سکتا اور نہ کسی بھی ترجمہ میں اصل کو کما حقہٗ اور تمام تر منتقل کیا جا سکتا ہے وہ ہر حالت میں مترجم کی فہم و فراست کا ممنونِ احسان ہوگا۔ لہٰذا آپ جب اور جس شخص کا ترجمہ بھی پڑھیں قرآن کے اصلِ متن کا آپ کے سامنے رہنا قطعی ضروری ہے تاکہ جہاں پر آپ کی فکر کو ترجمہ سے زحمت ہو وہاں آپ خود قرآن کے اصلِ متن اور وحیِ الٰہی کے الفاظ کی طرف رجوع کر سکیں اور اُس لفظ یا عبارت سے متعلق اپنے تئیں غور و فکر اور تلاش و جستجو کر سکیں۔

اگر کبھی کوئی نئی تحقیق یا رائے پیش ہوتی ہے تو بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ متقدمین کی تردید ہے حالانکہ کون ناخلف ہوگا جو اپنے بزرگوں اور اسلاف کی تنقیص و تکذیب کرے گا؟ علم و عقل کی جیوں جیوں ترقی ہوگی، نئی نئی باتیں نکلتی ہی آئیں گی اور معلوم ہی ہوں گی۔ پھر اگر ریل گاڑی کی ایجاد سے بیل گاڑی ایجاد کرنے والے بزرگوں کی تحقیر نہیں ہوتی، اگر ہوا گاڑی کی ایجاد سے ریل گاڑی ایجاد کرنے والے متقدمین کی تکذیب نہیں ہوتی، تو قرآن سے متعلق نئی نئی باتیں دریافت کرنے والوں پر یہ الزام کیسے دھرا جا سکتا ہے کہ وہ نئی نئی باتیں کہہ کر پُرانوں کا استخفاف کر رہے ہیں؟ مشہور سائنس داں چارلس گبن نے اپنی کتاب کے خاتمہ پر خوب کہا ہے کہ:۔

"آج جو علمی خیالات ہم میں رائج ہیں، یقیناً ہمارے اجداد اُن سے

مختلف خیالات رکھتے تھے۔ گزشتہ ابواب کتاب میں دیکھا ہوگا کہ پچھلے قرن میں کس قدر گریز پا ترقی ہوئی ہے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ہمارے اسلاف جن چیزوں کو جو کچھ سمجھتے تھے، اُن سے ہم چیزوں کو کتنا مختلف پاتے ہیں۔ وہ نور اور حرارت کو مادی اشیاء تصور کرتے تھے۔ ہم قطعی طور سے جانتے ہیں کہ وہ دائرہ سائرہ ایتھر میں حرکت کے محض مختلف طریقے ہیں وہ جواہر مادہ کو غیر فانی اور ابدی سمجھتے تھے لیکن ہم کو براہ راست تابکاری کے انکشافات سے یہ شہادت مل چکی ہے کہ ایسا نہیں ہے ... ... ہم کو اِس کا بھی اچھی طرح احساس ہے کہ ابھی بہت کچھ باقی ہے جس کی نسبت ہم کچھ نہیں جانتے یا بہت کم جانتے ہیں۔"

قرآن کا بھی یہی حال ہے۔ بہت سی چیزیں جو اب سمجھی گئی ہیں یقیناً پہلے نہیں سمجھی گئی تھیں۔ قرآن نے اصحابِ کہف کی پناہ گزینی "الرقیم" میں بتائی تھی۔ یہ "الرقیم" انیسویں صدی تک نہیں سمجھا جا سکا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد آثار قدیمہ کی تحقیق سے یہ بات صاف ہوئی کہ جزیرہ نمائے سینا اور خلیج عقبہ سے سیدھے شمال کی طرف جو دو متوازی پہاڑی سلسلے ہیں، اُن ہی میں سے ایک پہاڑی پر "الرقیم" نام کا ایک قدیم شہر آباد تھا جو رومیوں کے یہاں "پیٹرا" اور عربوں کے یہاں "بطرا" کے نام سے بعد میں مشہور ہوا تھا یہاں غار بھی ملے اور ندی کے دہانے کے پاس قدیم عمارتوں کے آثار بھی پائے گئے۔ اسی طرح قرآن نے "ذوالقرنین" کا ذکر کیا ہے۔ حضرت علامہ آزاد پہلے شخص ہیں جنھوں نے یہ پتہ چلایا کہ "ذوالقرنین" سے مراد پارس (ایران) کا وہ بادشاہ ہے جو یونانیوں کے یہاں سائرس عبرانیوں کے یہاں خورس اور عربوں کے یہاں "خسرو" کے

نام سے پکارا اور یاد کیا جاتا ہے اور اس کا کارنامہ چھٹی صدی قبلِ مسیح کا وسطی حصہ ہے۔ اسی طرح حضرت علامہ اسلم جیراجپوری مرحوم پہلے شخص ہیں جنھوں نے آیاتِ وراثت میں یہ دریافت کیا کہ لفظ "اقرب" بمعنی "وارث" نہیں جیسا کہ تمام طور پہ سمجھا گیا بلکہ بمعنی "مورث" آیا ہے۔ اور انھوں نے ایک کتاب لکھ کر "محجوب الارث" کے فقہی مسئلے کو خلافِ قرآن بتایا یا حضرت علامہ آزاد نے یہ انکشاف فرمایا کہ قرآن میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو:-

"لغت میں عام معنی کے لئے استعمال کئے جاتے تھے مگر انھیں قرآنِ حکیم نے اپنے خاص مصطلحہ شرحِ معانی کے لئے اختیار کر لیا ہے"۔

ظاہر ہے کہ متاخرین کے اِن انکشافات و اکتشافات سے متقدمین کی قرآن فہمی پر ذرا بھی زد نہیں پڑتی اور کوئی حرف نہیں آتا۔ انھوں نے جو سنگِ بنیاد رکھا تھا، اُسی پر نئی نئی عمارت کھڑی ہو رہی ہے اور آیندہ بھی اونچی ہوتی جائے گی۔ قرآن تو ایک لاانتہا چیز ہے:-

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ	"جتنے بھی درخت زمین میں ہیں وہ قلم بن
شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ	جائیں اور یہ جو سمندر ہے بلکہ اس کے علاوہ
مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا	سات سمندروں کا پانی سیاہی بن جائے
نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ (لقمٰن ۳ ـ ۲۷)	تو بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی"۔

پھر کیا ہر نئی تحقیق، پچھلوں کی تردید کہلائے گی؟ کس قدر صحیح بات فرمائی ہے حضرت علامہ سید سلیمان ندوی نے "سیرۃ النبی" جلد ۳ صفحہ ۲۶ پر کہ:-

"اس کا فیصلہ ہر شخص خود کر سکتا ہے کہ اُس کے گذشتہ مشاہدات اور تجربات میں غلطی کا ہونا یا اُس میں انقلاب ہو جانا کچھ محال نہیں۔ طبعیاتِ جدیدہ نے طبعیاتِ قدیمہ کی دیوار ڈھا دی۔ حکمائے جدید

نے، حکمائے قدیم کے سینکڑوں تجربات باطل کر دئے۔ ہیئتِ قدیم اور ہیئتِ جدید میں آسمان اور زمین کا اختلاف پیدا ہو گیا۔ اختراعات جدیدہ نے سیکڑوں اور ہزاروں قدیم مستبعدات اور ممتنعات کو ممکن بلکہ واقعہ بنا دیا۔ جب ہمارے گذشتہ تجربات اور تحقیقات کا یہ حال ہے تو انسانی تحقیقات کی آئندہ صحت کی کون ضمانت کر سکتا ہے؟ فلسفۂ یونان پڑھ کر ہم یقین کرتے تھے کہ زمین ساکن اور آفتاب متحرک ہے۔ اب روزِ روشن کی طرح یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ آفتاب ساکن اور زمین متحرک ہے۔"

ظاہر ہے کہ تحقیق و تلاش اور تدبر و تفکر سے علم بڑھتا جائے گا اور حقائقِ کائنات، لوگوں پر واضح ہوتے جائیں گے اور یہ انقلاب قیامت تک جاری رہے گا اور اس سے کبھی قدمار پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔

آخر میں اتنا اور کہنا ہے کہ میں قرآن کو فلسفۂ و سائنس خواہ فلکیات و ارضیات یا کسی بھی علم و فن اور صنعت و حرفت کی کتاب نہیں مانتا بلکہ اُسے صرف "چشمۂ ہدایت" یعنی "رہنمائی کرنے والا صحیفہ" سمجھتا ہوں۔ مگر میں "رہنمائی" کے لئے کسی مخصوص راہ کی بھی قید کو تسلیم نہیں کرتا۔ جب قرآن تمام بنی نوع انسان کی پوری زندگی کے لئے دُنیا میں "رہنما" بن کر آیا ہے تو وہ ہماری علم کے ہر شعبے میں، حیات کی ہر وادی میں اور عمل کے ہر دائرے میں رہنمائی کرے گا اور کرتا رہے گا۔ فلاح و بہبود کی کوئی راہ ایسی نہیں ہو سکتی جس کی نشاندہی سے قرآن قاصر و مجبور ہو۔

میں "نظریات" کو قرآن سے مطابق کر دکھانے کا بھی شوقین نہیں۔ مگر مسلمات سے بھی قرآن کے یکسر خالی ہونے کا حامی نہیں۔ جب قرآن ہر

فرد بشر کو راستہ دکھانے آیا ہے تو یقیناً وہ ہر شخص کی رہنمائی کرے گا چاہے وہ فلسفی ہو یا سائنسداں، وہ مقنن ہو یا حکمراں۔ قرآن کے دعوے ہی ہیں کہ:۔

(۱) مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (انعام ۴۔ $\frac{۲}{۳۸}$) "ہم نے اس کتاب میں کوئی بھی شے چھوڑی نہیں ہے۔"

(۲) نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (نحل ۱۲۔ $\frac{۱۴}{۸۹}$) "ہم نے تم پر ایسی کتاب نازل کی ہے جو ساری باتوں کو بیان کرنے والی ہے۔"

(۳) وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا (بنی اسرائیل ۲۔ $\frac{۱}{۱۲}$) "اور ہم نے ہر چیز کو خوب تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔"

(۴) وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا (بنی اسرائیل ۱۰۔ $\frac{۱۴}{۸۹}$) "اور باوجودیکہ ہم نے اس قرآن میں بنی نوع انسان کے لئے ہر طرح کی باتیں کھول کھول کر بیان کر دی ہیں مگر اکثریت اُن کی ہے جو اس کا انکار کئے بغیر نہیں رہتے۔"

(۵) وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا (نساء ۱۸ $\frac{۲}{۱۲۲}$) "اللہ کے تمام وعدے سچے ہیں۔ اور اللہ سے زیادہ کس کا کہنا صحیح ہوگا؟"

پھر وہ کیسے کسی متلاشی کو محروم کر سکتا ہے؟ دراصل ہمارے یہاں ہر مسئلے میں افراط و تفریط کا عمل دخل ہو گیا ہے حالانکہ "اسلام" کا دوسرا نام ہی "اعتدال" ہے۔ اسلام نہ تو "دنیا" کو بالکل ہی نظر انداز کر دینے کو کہتا ہے۔ کہ اُس کی ترقی کی طرف کوئی توجہ ہی نہ دی جائے اور نہ وہ دُنیا پرست ہی بن جانے کو کہتا ہے کہ ہم "دین" سے بالکل کنارہ کش ہی ہو جائیں۔

قرآن نہ تو علوم و فنون کی رہنمائی سے بالکل خالی ہے کہ ہم اِس معاملہ میں اُس سے کوئی فائدہ ہی حاصل نہ کر سکیں اور نہ وہ کوئی فنی کتاب ہی ہے کہ ہم اُس میں ہر ہر چیز کی جزئیات و تفصیلات بھی تلاش کریں۔

قرآن کے سمجھنے کا انحصار نہ تو عربی دانی ہی پر ہے کہ اب وہ ترجمہ سے سمجھا ہی نہ جا سکے اور ہم بے سمجھے بوجھے عربی متن صرف زبان سے دُہراتے رہیں اور نہ ہی کوئی ترجمہ ہی قرآن کے اصل متن کا نعم البدل ہو سکتا ہے کہ اصلِ متن اور الفاظِ قرآن کو بالکل ہی چھوڑ کے صرف ترجمہ ہی کو اصلی قرآن سمجھ لیا جائے۔

قرآن بھی نہ تو بس اگلے بزرگوں ہی پر ختم ہو گئی ہے کہ اب مزید کچھ سوچ بچار اور غور و فکر ہی نہ کیا جائے اور نہ ہمارے متقدمین نے جو کچھ بھی سمجھا تھا وہ غلط ہی تھا کہ اب ہم اُن کی کاوشوں کو تضیعِ اوقات سمجھ کر بالکل ہی نظر انداز کر دیں اور اُن سے استفادہ ہی نہ کریں۔

ہم جب بھی کسی معاملے میں بھی خوشگوار توازن اور مناسب اعتدال کی راہ سے ہٹ جائیں گے، قرآن بھی ہم سے دُور ہو جائے گا کیونکہ یہی اُسکا پیغام ہے :-

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ	"ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا واضح احکام
وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ	دے کر اور ہم نے اُن سبھوں کے ساتھ
وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ	قانون اور اُصولِ توازن نازل کیا تاکہ وہ
بِالْقِسْطِ (حدید ۲۔ ۲۵)	لوگوں کو اعتدالی خط پر قائم کر دیں"

فقط

کریم چک، چھپرہ (سارن)
۲۷ رمضان المبارک ۱۳۷۰ھ

عطاء اللہ پالوی

آیۂ "تسخیر" اندر شانِ کیست؟
ایں سپہرِ نیلگوں حیرانِ کیست؟
رازدانِ "علّم الاسماء" کہ بود؟
مستِ آں ساقی و آں صہبا کہ بود؟

(اقبال)

(جاوید نامہ صفحہ ۲)

"سبع مثانی"

عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ نیلگوں افلاک (اقبالؔ)

قرآن مجید کے چودہویں پارہ میں، قرآن کی پندرہویں سورۃ "الحجر" کے آخری رکوع کی ایک آیت یہ ہے:۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ (۱۵/۸۷)

اس آیت میں جناب رسالتمآب سیدنا حضرت محمد رسول اللہ علیہ السلام کو بارگاہِ ربُّ العزّت سے دو چیزیں عطا کی جانے کا ذکر کیا گیا ہے:۔

"سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ" اور "قُرْاٰنَ الْعَظِيْم"
(مثانی میں سے سات) (زبردست قرآن)

سوال یہ ہے کہ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ سے کیا مراد ہے؟ حضرت علامہ ابوالکلام آزاد نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "ترجمان القرآن" جلد اول کی ابتدا یوں فرمائی ہے:۔

"سورۂ فاتحہ قرآن کی سب سے پہلی سورت ہے اسلئے "فاتحۃ الکتاب" کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ جو بات زیادہ اہم ہوتی ہے قدرتی طور پر پہلی اور نمایاں جگہ پاتی ہے یہ سورت قرآن کی تمام سورتوں میں خاص اہمیت رکھتی ہے، اس لئے قدرتی طور پر اسکی موزوں

جگہ قرآن کے پہلے صفحہ پر ہی جگہ قرار پائی۔ چنانچہ خود قرآن نے اس کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے جس سے اس کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے:

وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ (۱۵: ۸۷)

"اے پیغمبر یہ واقعہ ہے کہ ہم نے تمہیں سات دہرائی جانے والی چیزیں عطا فرمائیں اور قرآن عظیم"

احادیث و آثار سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس آیت میں "سات دہرائی جانے والی چیزوں" سے مقصود یہی سورت ہے کیونکہ یہ سات آیتوں کا مجموعہ ہے اور ہمیشہ نماز میں دہرائی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس سورت کو "سبع مثانی" بھی کہتے ہیں۔"

قرآن کی تفسیریں تیسری صدی ہجری سے سطور ہذا کی تحریر تک اتنی لکھی گئی ہیں جن کی تعداد کا صحیح اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا چہ جائیکہ ان کا مطالعہ کرنا۔ لہٰذا ان کا حوالہ دینا ممکن نہیں ہے، تاہم "تفسیر بیان السبحان" میں جو زیر تالیف ہے اور جسے تیسری صدی ہجری سے چودھویں صدی ہجری تک کی تفاسیر کا نچوڑ کہا گیا ہے، بیان ہوا ہے کہ:-

(۱) "ابن مسعود، ابن عمر، ابن عباس، مجاہد، سعید بن جبیر، ضحاک اور غیرہم کا خیال ہے کہ "سبع مثانی" سے مراد سات طویل سورتیں ہیں یعنی سورۂ بقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ، انعام، اعراف اور یونس اور "قرآن عظیم" سے مراد باقی قرآن۔ یا قرآن سے پورا قرآن مراد ہے اور "سبع مثانی" سے "سبع طوال" اور یہ ساتوں سورتیں بھی قرآن عظیم کا جزو ہیں۔ بعض نے کہا کہ چونکہ ان سورتوں میں فرائض، حدود، قصص اور احکام مکرر بیان ہوتے ہیں اس لئے ان کو مثانی (مکرر) فرمایا۔ ابن عباس نے فرمایا "ان سورتوں میں امثال، اخبار اور مضامین عبرت کو مکرر بیان فرمایا ہے"۔

(جلد ۱۴ صفحہ ۵۹)

(۲) "حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ، نخعیؒ، عبداللہ بن عبید، ابن ابی ملیکہ، شہر بن حوشب، حسن بصری اور قتادہ وغیرہم کا قول ہے اور ابن مسعود اور ابن عباسؓ سے بھی روایت ہے کہ "سبع مثانی" سے مراد "سورہ فاتحہ" ہے جس کی سات آیات ہیں۔ پہلی آیت بسم اللہ ہے اور قرآنِ عظیم سے مراد بھی یہی سورہ ہے۔" (جلد ۱۴ صفحہ ۵۹)

سوال یہ ہے کہ جب آنحضرتؐ نے واقعی صاف طور پر فرما دیا تھا کہ "سبع مثانی" سے مراد "سورۂ فاتحہ" ہے تو صحابہ کے درمیان اختلافِ رائے کیوں ہے؟ کچھ صحابہؓ نے "سبع مثانی" سے مراد "سبع طوال" کیونکر لیا؟ اور کچھ نے اسے "سورۂ فاتحہ" کیسے قرار دیا؟ اور پھر دونوں مکتبۂ خیال میں حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباسؓ دونوں کا نام کس طرح موجود ہے؟ بہرحال! زیادہ اہم یا مانی ہوئی رائے یہی ہے کہ "سبع مثانی" سے مراد "سورۂ فاتحہ" ہے۔ وجہ یہ بیان ہوئی ہے کہ اس سورہ میں سات آیتیں ہیں اور یہ نماز میں بار بار دہرائی جاتی ہے۔ ہر چند کہ اس رائے کو تسلیم کرنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے، مثلاً:-

(۱)

اِس آیۂ کریمہ میں "آیتوں" کا کوئی ذکر نہیں جس کی رعایت سے "سات آیتیں" مراد لینا ٹھیک ہو، نہ ہی اس آیت میں کسی طرح بھی "نماز" کا کوئی بیان ہے اور نہ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ بار بار پڑھی جاتی ہے۔ قرآن کے قول کے مطابق ایک رکعت "نماز" کہلاتی ہے۔ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی نے "سیرۃ النبیؐ" جلد ۵ میں "نماز" کو سمجھاتے ہوئے سورۂ نساء کی نمازِ جنگ والی آیت کے بارے میں لکھا ہے:-

"اس آیت میں غور کرنے کی دو باتیں ہیں۔ اول یہ کہ ایک رکعت، جو باقاعدہ ادا ہوئی اُس کو "الصلوٰۃ" (نماز) کہا گیا اور دوسری رکعت جو خدا کا نام اُٹھ کر، بیٹھ کر، جھک کر، لیٹے اور لڑائی، حملہ اور مدافعت کی حالت میں پوری ہوئی اُس کو صرف "ذکر اللہ" کہا گیا"۔

اب ہر رکعت یا ہر نماز میں سورۂ فاتحہ کو ایک بار پڑھنے سے اُس کو بار بار دُہرانا تو نہیں کہا جا سکتا۔ "تکرار" کا مفہوم کسی چیز کو بلا کسی وقفہ کے دُہرانا ہوتا ہے اس لئے "سورۂ فاتحہ" پر لفظ "مثانی" کی بار بار دُہرائی جانے والی تعریف صادق نہیں آتی۔

(۲)

سورۂ فاتحہ سات آیتوں کی سورہ ہے ہی نہیں بلکہ اُس میں صرف چھ آیتیں ہیں اور اگر "بسم اللہ" کو ملا کر سات آیتیں پوری کرنی ہوں تو اس قرآن کی سب سے پہلی سورۃ "سورۂ فاتحہ" ہی کی تخصیص کیوں؟ قرآن کی سب سے آخری سورہ "سورۂ والناس" بھی چھ آیتوں کی سورہ ہے اور بسم اللہ کو ملا دینے سے اُس کی بھی سات آیتیں پوری ہو جاتی ہیں۔ اس سے قطع نظر اگر "سبع مثانی" سے سات آیتوں والی سورہ ہی مراد لینا ہو تو اِس قدر کھینچ تان کی کیا ضرورت ہے جبکہ واقعی سات آیتوں والی دو دو سورتیں "سورۂ الم نشرح" اور "سورۂ ماعون" قرآن میں موجود ہی ہیں؟

سورۂ فاتحہ قرآن کی سب سے پہلی سورہ ہے اور وہ چھ آیتوں کی ہے اور "سورۂ والنّاس" قرآن کی سب سے آخری سورہ ہے اور وہ بھی چھ آیتوں کی ہے۔ یعنی قرآن کی ابتدا اور انتہا دونوں چھ آیتوں والی سورہ پر ہوتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خصوصی حسنِ قرآن ہے پھر سب سے پہلی سورہ میں

بسم اللہ کو جوڑ کر سورۂ فاتحہ کو خواہ مخواہ سات آیتوں والی سورہ بنانا اس خصوصیتِ قرآن کو ختم کرنا ہے۔

(۳)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ہر سورہ کی ابتدا میں ہے اور یہ آیت قرآن ہی کی سورۂ نمل سے تبرکاً لی گئی اور ہر سورہ کا سرنامہ بنائی گئی ہے۔ اسی لئے کسی سورہ میں بسم اللہ کو سورہ کا جُزو یا پہلی آیت نہیں مانا گیا۔ خود سورۂ نمل میں بھی شروع والی بسم اللہ جزوِ سورہ نہیں۔ پھر سورۂ فاتحہ میں بسم اللہ کو جزوِ سورہ ماننے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، بالخصوص جبکہ روایت میں بھی یہ نہیں ہے کہ آنحضرت نے سورۂ فاتحہ کی بسم اللہ کو جزوِ سورہ ماننے کا حکم صادر فرمایا تھا۔

(۴)

نماز کے لئے اصل عربی لفظ صلوٰۃ ہے جس کے معنی دعا کے ہیں اور نماز میں قرآن پڑھنے کا حکم ہے :-

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ "سو تم لوگ جتنا آسانی سے ہو سکے قرآن میں سے پڑھا کرو"
(مُزمّل ۲۰ - پ ۲۹)

اب اگر "سورۂ فاتحہ" قرآنِ عظیم سے الگ ہے تو محض سورۂ فاتحہ پڑھنے سے نماز نہیں ہو سکتی، حالانکہ سارے لوگ اس امر پر متفق ہیں کہ نماز میں محض سورۂ فاتحہ پڑھنے سے بھی نماز ہو جاتی ہے۔ اور اگر سورۂ فاتحہ قرآن کا جزو ہی سمجھا جائے تو پھر وہ سبع مثانی کیونکر ہوئی جبکہ "سبع مثانی" کو قرآنِ عظیم سے الگ ایک دوسری چیز کہا گیا ہے؟"

(۵)

قرآن میں خود قرآن کے لئے بہت سے الفاظ آئے ہیں اور ہر جگہ

اس سے مراد پورا قرآن ہے مثلاً:-

وَقَدْ اٰتَیْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا (طٰہٰ - ۵ - ۹۹/۲۰) "اور بے شک ہم نے تجھے اپنے پاس سے نصیحت نامہ (قرآن) دیا ہے"۔

پھر سورۂ الحجر کی آیات میں "قرآن عظیم" سے "سورۂ فاتحہ" کو جدا کیونکر سمجھا جائے؟ بالخصوص اس لیے کہ قرآن نے خود ہی تقسیم قرآن کی مذمت کی ہے؛ چنانچہ اسی سورۂ الحجر میں اور اسی آخری ہی رکوع میں جس میں سبع مثانی والی زیرِ بحث آیت ہے، بلکہ سبع مثانی والی آیت کے محض ایک ہی آیت بعد بطورِ خاص اُن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جنھوں نے اپنے قرآن یعنی آسمانی نصیحت نامہ کے ٹکڑے کر رکھے تھے:۔

وَقُلْ اِنِّیْٓ اَنَا النَّذِیْرُ الْمُبِیْنُ ۚ كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِیْنَ ۙ الَّذِیْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِیْنَ ۚ فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۙ (۱۵/۸۹-۹۲)

"اور کہہ دو کہ میں تو صرف ڈرانے والا ہوں، جیسے ہم نے اُن تقسیم کر ڈالنے والوں پر نازل کیا تھا جنھوں نے قرآن کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے سو آپ کے پروردگار کی قسم ہم اُن سے ضرور بازپرس کریں گے"۔

غور فرمائیے۔ یہاں اہلِ کتاب کی کتاب کو عام دستور کے مطابق "کتاب" نہیں کہا گیا۔ بلکہ "قرآن" کہا گیا ہے اور اُن لوگوں نے جو اپنے قرآن کی تقسیم کر ڈالی تھی اُسے قابلِ پرسش فعل قرار دیا گیا ہے، پھر اللہ تعالیٰ انہیں پر ہمارے قرآنِ عظیم کو خود تقسیم کر کے اس کے ایک جُزو کو "سبع مثانی" اور دوسرے جُزو کو "قرآنِ عظیم" کیسے کہہ سکتا تھا؟ تب تو یہ کھلا تضاد ہوا جس کا قرآن منکر ہے۔ (۸۲/۴) نیز یہ بات اہم ہے کہ "قرآن" کے "عضین" کرنے کی بات اسی سورۂ اسی رکوع اور اسی مقام پر محض ایک آیت کے فرق سے کیوں کہی گئی ہے؟ اور

خلافِ دستور یہاں پر اہلِ کتاب کی "کتاب" کو "قرآن" کیوں کہا گیا؟ اس ایک مقام کے سوا اور کہیں پر دوسری آسمانی کتابوں کے لئے "قرآن" کا لفظ نہیں آیا ہے انداز یہ ہے کہ یہ اِس جگہ صرف اس لئے کہا گیا کہ کہیں لوگ "قرآنِ عظیم" کو بھی "عضین" کر کے "سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ" کو قرآن ہی کا کوئی ٹکڑہ نہ سمجھیں بلکہ اس امر پر غور کریں کہ اللہ تعالیٰ نے "قرآنِ عظیم" کے علاوہ اور کون سی ایسی سات عدد آنحضرت کو عنایت فرمائی ہے جو "مثانی" ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ جس طرح اہلِ کتاب کی "کتاب" کو بجز یہاں کے اور کہیں "قرآن" نہیں کہا گیا ہے، اسی طرح سوائے یہاں کے "قرآن" کیلئے "قرآنِ عظیم" کا لفظ بھی اور کہیں نہیں آیا ہے۔

(۶)

آنحضرت صلعم کے بارے میں ایک جگہ آیا ہے کہ :-

اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَیۡکُمۡ رَسُوۡلًا	"بے شک ہم نے تمھارے پاس ایک ایسا رسول
شَاہِدًا عَلَیۡکُمۡ کَمَاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ	بھیجا ہے جو تم پر گواہی دے گا، جیسا کہ ہم نے
اِلٰی فِرۡعَوۡنَ رَسُوۡلًا (مزمل ۱-۱۵/۲۹)	فرعون کے پاس ایک رسول بھیجا تھا"!

اِس آیت میں آنحضرت کی رسالت کو حضرتِ موسیٰؑ کی رسالت سے مماثل ظاہر کیا گیا ہے۔ اب جس طرح آنحضرت کو "سبع مثانی" دینے کا ذکر ہے اُسی طرح حضرتِ موسیٰ کو "تسع آیات" دینے کا ذکر کیا گیا ہے، فرمایا گیا ہے۔ کہ وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسٰی تِسۡعَ اٰیٰتٍ (۱۷/۱۰۱)" اور ہم نے موسیٰ کو دیا تھا نو آیات"! غور فرمائیے، یہاں لفظ "آیت" بھی موجود ہے مگر اس کے باوجود "تسع آیات" سے مراد کتابِ موسیٰؑ کی نو آیات نہیں بلکہ "کتاب" سے الگ دوسری نو چیزیں ہیں جن کا ذکر دوسری جگہ موجود ہے۔ یعنی سورۂ اعراف میں سات

چیزوں کا ذکر ہے (۱۳۰ - ۱۳۳) اور سورۂ نمل میں دو چیزوں کا (۱۲/۲۷) یہ کل ملا کر "تسع آیات" ہو جاتی ہیں۔ پھر جب حضرت موسیٰ کے ذکر میں "آیات" کا لفظ موجود ہوتے ہوئے، اس سے مراد کتابِ موسیٰ کی نو آیات نہیں بلکہ "کتاب" سے جدا "نو آیات" ہیں تو آنحضرت کی "سبع مثانی" سے مراد "قرآن عظیم" ہی کی کوئی "سات آیتیں" کس طرح ہو سکتی ہیں؟

(۷)

قرآن نے "سبع مثانی" نہیں کہا کہ "سورۂ فاتحہ" میں "بسم اللہ" کو جوڑ کر سات آیتیں پوری کر دی جائیں اور "سبع مثانی" مکمل ہو جائے۔ قرآن نے "سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ" کہا ہے۔ یعنی "مثانی" میں سے سات، جس کا صاف مطلب ہے کہ "مثانی" کی تعداد کافی ہے اور اُس میں سے صرف سات عدد آپ کو عنایت ہوئی ہے۔ سورۂ فاتحہ ایک تو سات آیتوں کی سورہ ہی نہیں اور اگر بسم اللہ کو اُس کا جزوِ لاینفک مان بھی لیا جائے تو کُل سات آیتیں ہوتی ہیں جو سب کی سب ہر رکعت میں دُہرائی جاتی ہیں۔ مگر قرآن یہ تو نہیں کہتا بلکہ فرماتا ہے کہ "مثانی" میں سے، یعنی دُہرائی جانے والی میں سے تم کو سات دیا ہے۔ اگر سورۂ فاتحہ زیادہ آیات کی سورہ ہوتی اور اس میں سے سات آیتیں ہر رکعت میں پڑھی جاتیں تو بات ایک حد تک درست بھی ہوتی مگر یہاں اِس کا موقع ہی نہیں۔ قرآن کا لفظ "سبع مثانی" (سات دُہرائی جانے والی چیز) ہے ہی نہیں بلکہ "سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ" (دُہرائی جانے والی چیزوں میں سے سات) ہے۔

علامہ ابوالکلام آزاد نے بدقت سات آیتیں دوسری طرح پوری کیں۔ اُنھوں نے سورۂ الحجر کے نوٹ میں فرمایا ہے کہ:

"یا تو "بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" بھی اس میں شامل ہے یعنی اس کی پہلی آیت ہے یا پھر "صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ" اور غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ دو آیتیں ہیں۔ ایک آیت نہیں۔ کیونکہ بغیر اس کے سات آیتوں کی تعداد بنتی نہیں "

(ترجمان القرآن جلد ۲ صفحہ ۲۹۶)

پھر بھی وہ یہ نہ فرماسکے کہ "سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ" کی تعریف "سورۃ فاتحہ" پر کس طرح صادق آسکتی ہے جبکہ "سورۃ فاتحہ" میں سات سے زیادہ آیتیں ہے ہی نہیں، اور یہاں زیادہ تعداد میں سے سات دینے کا ذکر ہے۔

یہ ہیں وہ دشواریاں جن کی وجہ سے "سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ" سے مراد "سورۃ فاتحہ" لینا مشکل ہوجاتا ہے، تاہم میرا مقصد نہ کسی کی تردید و تکذیب ہے اور نہ دل آزاری و دل شکنی بلکہ میرا مدعا صرف یہ ہے کہ لوگوں میں قرآن پر تدبر اور تفکر کا ذوق پیدا ہو، اس لئے میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ "سبع مثانی" سے مراد "سورۃ فاتحہ" ہی ہے اور یہ آنحضرت ہی نے فرمایا تھا لیکن اگر آنحضرت نے "سبع مثانی" کی یہ تفسیر فرمائی تھی تو بھی یہ لازم نہیں آتا کہ اب اس لفظ کی کوئی دوسری تفسیر نہیں ہوسکتی یا نہیں کی جاسکتی، کیوں کہ پھر آنحضرت نے لوگوں کو بذاتِ خود قرآن میں غور و فکر کرتے رہنے کی تاکید کیوں فرمائی تھی ؟ اگر آنحضرت کا مقصد یہ ہوتا کہ آگے کی فکری راہ بالکل ہی بند کردی جائے تو آپ خود لوگوں کو غور و فکر کا حکم نہ دیتے اور اگر ایسا ہوتا تو خود صحابۂ کرام، تابعین اور علماء سلف قرآنی الفاظ و آیات کی تفسیر میں باہم مخالف نہ ہوتے۔ مثلاً "سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ" کی ہی تفسیر میں مجاہد کا بھی نام آتا ہے۔ صاحبِ "تفسیر ابن کثیر" نے لکھا ہے:۔

"مجاہد بن جبیر تفسیر میں خدا کی ایک نشانی تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے تین مرتبہ اوّل سے آخر تک حضرت عبداللہ ابن عباس سے قرآن پاک سیکھا اور سمجھا۔"

اب ان مجاہد صاحب کی رائے اوروں سے مختلف ہے وہ بھی اور حضرت ابن عباس بھی مفسر ہیں کہ " سبع مثانی" سے مراد "سبع طوال" ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر آنحضرت نے اس سے مراد "سورۂ فاتحہ" فرمایا تھا تو انھیں ضرور اطلاع تھی مگر اُن کی اپنی فکر یہ تھی کہ اِس سے مراد "سبع طوال" ہیں۔ یا سورۂ فاتحہ کے "مثانی" ہونے کے سبب میں "شعبہ" کا خیال تھا کہ چونکہ "سبع طوال" (یعنی سات طویل سورتوں) میں فرائض، حدود قصص اور احکام مکرر بیان ہوئے ہیں اس لئے اُن کو "مثانی" کہا گیا ہے۔ مگر حضرت "ابن عباس" کا خیال تھا کہ چونکہ "سبع طوال" میں امثال، اخبار اور مضامینِ عبرت کو مکرر بیان کیا گیا ہے اس لئے اُن کو "مثانی" کہا گیا ہے۔[1]

غرض قرآن کے بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں تفسیر ماثور کے علاوہ بھی علماء سلف اور قدیم محققین نے دوسری تفسیریں کی ہیں مثلاً "اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ" کی تفسیر ماثور میں "کوثر" سے مراد ایک حوض لیا گیا ہے مگر صحابہ نے

---

[1] "سبع مثانی" کی تعریف "سبع طوال" پر صادق نہیں آتی۔ سورۂ الحجر جس میں سبع مثانی کا ذکر ہے مکی سورہ ہے۔ اور "سبع طوال" یعنی سات طویل سورتوں (البقرہ، آل عمران، مائدہ، انعام، اعراف، اور یونس) میں سے پہلی چار سورتیں مدنی ہیں۔ اس سے زیادہ لگتی ہوئی بات پہلی ہی ہے یعنی سورۂ فاتحہ، کیوں کہ وہ مکی سورہ ہے۔ علاوہ بریں "آیات" سے بات "سورہ" تک چلی جاتی ہے جس سے اور بھی دقتیں پیدا ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ دوسرا مطلب بھی بیان کیا ہے جیسا کہ ابن عباس کہتے ہیں کہ کوثر سے مراد خیر کثیر ہے اور بعضوں نے "کوثر" سے مراد "قرآن" لیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں رسول اللہ سے کوئی تفسیر آئی ہے اور مزید تدبّر فی القرآن کی ممانعت نہیں فرمائی گئی ہے، وہاں مزید تفکّر و تدبّر سے دوسرے معانی بھی حاصل ہوتے اور ہوسکتے ہیں اور غالباً یہی مطلب ہے "انزل القرآن علیٰ سبعة احرف" کا۔ چنانچہ اکثر علماء نے "احرف" سے مراد "مطالب" ہی لئے ہیں۔ یعنی آیتوں کی تفاسیر میں سات مطالب تک نکلتے یا نکل سکتے ہیں۔ قرآن میں ایک دلالتہ النّص ہے، دوسرے اشارۃ النّص۔ علمائے تفسیر نے بے شمار مقامات پر اشارۃ النّص سے دوسری تفسیر مراد لی ہے جو دلالتہ النّص کی تفسیر کی مخالف نہیں سمجھی جاتی، جیسا کہ امام بخاری "اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡن" کی تفسیر "لیوحدون" کرتے ہیں۔ حالانکہ عبادت کی دلالتہ النّص وحدت نہیں بلکہ یہ اشارۃ النّص ہے۔ لہذا اگر میں بھی "سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ" کی تفسیر کچھ اور کروں تو اسے تفسیر ماثور کی مخالفت پر محمول نہ کرنا چاہیئے۔ ویسے اس کی کوئی گنجائش بھی نہیں کیونکہ میں اپنی بات دوسرے انداز سے کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ "کتاب" اور "کائنات" دونوں میں اللہ تعالیٰ کی "آیتیں" بھری ہوئی ہیں اور دونوں ہی میں یکساں "تدبّر و تفکّر" کا حکم دیا گیا ہے:۔

(۱) کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَیۡكَ مُبٰرَكٌ لِّیَدَّبَّرُوۡۤا اٰیٰتِهٖ وَلِیَتَذَكَّرَ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ (ص ۳۸ - ۲۹)

"یہ کتاب جو ہم نے تم پر نازل کی ہے بہت ہی مبارک کتاب ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں غور و فکر کریں اور اہل عقل نصیحت حاصل کریں۔"

(۲) اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۝ (آل عمران ۳۔ ۱۹۰)

"بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور شب و روز کے اختلاف میں آیات ہیں اُن کے لئے جو اہلِ عقل ہیں۔"

سر ولیم تیور بھی اس نکتہ کو پا گیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اِس میں کوئی شک ہی نہیں کہ:-

"قرآن ہستیِ باری تعالیٰ کے متعلق مظاہر قدرت سے عجب عجیب دلائل مستنبط کرتا ہے۔"

یہ اس لئے کہ قرآن "خدا کا کلام" (WORD OF GOD) اور کائنات "خدا کا کام" (WORK OF GOD) ہے اور اللہ تعالیٰ کے قول و فعل میں تضاد ممکن ہی نہیں۔ صداقت کے معنی یہ ہیں کہ اِن دونوں میں مکمل یکسانیت اور مطلق مطابقت ہو، لہٰذا صحیفۂ الٰہی (قرآن) اور صحیفۂ فطرت (کائنات) دونوں میں ایک خاص رشتہ اور وابستگی ہے۔ ایک خاص تعلق اور یک جہتی ہے۔ اندریں صورت دونوں ہی میں یکساں غور و فکر ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اس اُصول پر غور و فکر سے سورۂ الحجر کی متذکرۂ بالا "سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ" والی آیت کے بارے میں، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ "سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ" سے مُراد:-

(۱) جہاں تک کہ "آیاتِ کتاب" کا تعلق ہے "سورۂ فاتحہ" ہے۔

(۲) جہاں تک کہ "آیاتِ کائنات" کا سروکار ہے "سبع سمٰوٰت" ہے

میں کیوں اور کیسے اِس نتیجے پر پہنچا ہوں عرض کئے دیتا ہوں۔

قرآن نے جس طرح سورۂ الحجر کے چھٹے رکوع کی ایک آیت

میں رسول اللہ صلعم کو دو چیزیں دینے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :۔

اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ (۱۵/۸۷)

اسی طرح سورۂ مومنون کے پانچویں رکوع کی ایک آیت میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں فرمایا ہے :۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ (۲۳/۸۶)

یعنی رسول اللہ کے بارے میں ہے کہ ان کو دو چیزیں دی گئیں :۔

سبع مثانی اور قرآن عظیم

اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہے کہ وہ "رب" ہے دو چیزوں کا :۔

سبع سمٰوٰت اور عرش عظیم

لہٰذا "سبع مثانی" سے مراد "سبع سموات" ہیں۔ "مثانی" سے مراد صرف بار بار دُہرائی جانے والی چیز نہیں بلکہ چکر کاٹنے والی، گردش میں رہنے والی چیز بھی ہے۔ خود قرآن کی ایک تعریف "مثانی" کی گئی ہے۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ	"اللہ نے بہترین حدیث نازل فرمائی۔
کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ	ایسی کتاب جو اگلی کتابوں سے ملتی جلتی
(زمر۔۳ ۳۹/۲۳)	مشابہ ہے۔ مثانی ہے"

قرآن کی تعریف "مثانی" نہایت بلیغ ہے۔ اوّل یہ قرآن "زمین" پر نازل ہوا ہے جو ہر وقت گردش میں ہے، چکر کاٹ رہی ہے اس لئے لازماً قرآن بھی ہر وقت گردش کر رہا ہے۔ دوم قرآن ہر وقت کہیں نہ کہیں دنیا میں گردشِ لیل و نہار کے فرق کے سبب پڑھتا ہی رہا جاتا ہے۔ سوم ہر شخص قرآن کو بار بار دُہراتا رہتا ہے اور اُس کی گردش ختم نہیں ہوتی۔ چہارم قرآن میں احکامات بالعموم بار بار دُہرائے گئے ہیں، بیان ہوئے ہیں ایک

ہی اللہ، ایک ہی حکم۔ مگر وہ بار بار دہرایا گیا ہے :۔

(۱) اِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ — "یہی کچھ تو اگلی کتابوں میں بھی تھا۔"
(شعرا ۱۰۔ ۲۶/۱۹۶)

(۲) مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ؕ — "تم سے تو وہی کچھ کہا جا رہا ہے جو تم سے پہلے کے رسولوں کو کہا گیا تھا۔"
(حم سجدہ ۵۔ ۴۱/۴۳)

(۳) اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى — "یہی کچھ تو اس سے پہلے کے صحائف میں بھی تھا۔"
(اعلیٰ ا۔ ۸۷/۱۸)

اس سے ظاہر ہوا کہ قرآن نے سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ میں "مثانی" سے مراد گردش کرنے والی شے اور چکر کاٹتی رہنے والی چیز لیا ہے کیونکہ آگے قرآن کا ذکر موجود ہے۔ لہٰذا آیتِ زیرِ بحث میں لامحالہ "مثانی" سے مراد "سمٰوٰت" ہیں جو گردش کر رہے ہیں، ہر وقت چکر کاٹ رہے ہیں اور اگر سبع سمٰوٰت کو "سبع شداد"، یا "سبع طباق" کہا جا سکتا ہے تو اُسے "سبع مثانی" کیوں نہیں کہا جا سکتا؟

اللہ تعالیٰ ساری چیزوں کا بلا شرکت الغیرے مالک ہے اور اُس نے بالعموم ہر جگہ اپنے کو "ربّ السمٰوٰت" کہا ہے۔ پھر اُس نے اِس آیت میں "رَبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ" (سات آسمانوں کا پروردگار) کیوں کہا؟ صرف سات آسمانوں کے "ربّ" ہونے کی تخصیص کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اِس ایک مقام کے سوا قرآن میں اور کسی جگہ بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی تعریف "رَبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ" کے لفظ سے نہیں کی ہے اور نہ اس ایک جگہ کے سوا اور کہیں "قرآن العظیم" کا لفظ آیا ہے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ یہ دونوں آیتیں ایک طرح اور ایک انداز کی بلا سبب نہیں۔ بلکہ اس لئے ہیں کہ :۔

"خدا والی آیت کے انداز و الفاظ سے"

اُس کے :-

"رسول والی آیت تک ذہن رسائی حاصل کرے"

"عرشِ عظیم" اور "قرآن عظیم" کی یکسانیت سے "سبع مثانی" کو "سبع سموٰت" سمجھا جائے۔ خدا سے رسول تک اور رسول سے خدا تک، فرشِ زمین کے قرآن سے عرشِ بریں کے خدا تک سب ایک ہو جائے

اللہ تعالیٰ نے "رَبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبۡعِ" اس لئے کہا کہ ان ساتوں آسمانوں میں آبادیاں ہیں۔ اُن میں جاندار اور ذی حیات بستے ہیں۔ پرورش و تربیت کرنے والے کو عربی میں "رب" فارسی میں "پروردگار" اور اُردو میں "پالن ہار" کہتے ہیں۔ "ربوبیت" تمام ضروریاتِ زندگی کے بہم پہنچانے کو کہتے ہیں۔ والدین کے بارے میں ہے کہ :-

قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا (بنی اسرائیل ۲۔ ۲۴/۱۵)	"کہہ اے میرے پروردگار! ان دونوں پر رحمت فرما جیسا کہ انھوں نے بچپن میں میری پرورش کی ہے"

فرعون نے اللہ تعالیٰ کی تعریف حضرت موسیٰ سے پوچھی تو اُنھوں نے فرمایا :-

(۱) رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا (شعرا ۲۔ ۲۴/۲)	"وہ ربوبیت کرنے والا ہے اُن کا جو آسمانوں زمین اور جو اُن کے درمیان میں ہیں"
(۲) رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ (شعرا ۲۔ ۲۵/۲)	"وہ ربوبیت کرنے والا ہے تمہارا اور تمہارے ہمارے اگلے باپ دادوں کا"

حضرت یوسفؑ نے عزیزِ مصر کو اپنا "رب" کہا تھا اس لئے کہ اُس نے اُنکی پرورش و تربیت کی تھی :-

اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ط ، "وہ میرا ربوبیت کرنے والا ہے اُس نے کتنے

(یوسف ۲۰ ۱۲/۲۳) اچھے طریقے پر مجھے رکھا ہے۔"

حضرت یوسفؑ نے پرورش و پرداخت کرنے ہی کے سبب سے فرعون کو بھی ساقی کا رب کہا تھا۔

اُذۡكُرۡنِیۡ عِنۡدَ رَبِّكَ "تو اپنے ربوبیت کرنے والے سے میرا ذکر کرنا۔"
(یوسف ۵۔ ۱۲/۴۲)

غرض جو ذی حیات ہیں، جاندار ہیں اُن کی پرورش و پرداخت کو ربوبیت کہتے ہیں اور جس کے ذمہ یہ فرض ہو وہ "رب" کہلاتا ہے۔ جہاں بھی ربوبیت کا سوال آئے جانداری ضروری ہے۔ "ربُّ السمٰوٰتِ السّبع" کہنے سے صاف ظاہر ہے کہ ساتوں آسمانوں میں آبادیاں ہیں، زندگیاں ہیں جن کی ربوبیت کی جاتی ہے۔ اسی لئے حضرت موسیٰ نے فرعون سے کہیں زیادہ برتر ثابت کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی تعریف میں فرمایا تھا کہ میرا اللہ وہ ہے جو زمین والوں ہی کا نہیں بلکہ آسمان والوں کی بھی پرورش کرتا ہے۔ اس کے بالمقابل "سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ" کے الفاظ سے، ساتوں گردش کرنے والے آباد آسمانوں کا "قرآن عظیم" کا پیغام پہنچانے کے لئے، رسول اللہ صلعم کو دیا جانا ظاہر کیا گیا ہے۔ "قرآن عظیم" کا لفظ اس ایک جگہ کے سوا اور کہیں نہیں آیا یہاں "عظیم" اس کو اس رعایت سے کہا گیا ہے کہ اُس کی تعلیمات کو نہ صرف پورے کرۂ ارض پر پھیلنا ہے بلکہ انسانوں کے ساتھ اور اُنکے ذریعہ اُسے "سبع سمٰوٰت" تک پہنچنا ہو

"سبع مثانی" والی آیت کے اوپر والی آیت ملاحظہ فرمایئے، وہ یوں شروع ہوتی ہے:۔

وَمَا خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ "اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور اُن کے

وَمَا بَیْنَھُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ (الحجر۔ ۸۵) — درمیان کی چیزوں کو بغیر مصلحت کے پیدا نہیں کیا ہے۔"

اور "سبع مثانی" والی آیت کے بعد جو آیت ہے اُس میں کچھ لوگوں کے دنیاوی نعمتوں سے بہرہ مند ہونے کا ذکر ہے اور رسول اللہ سے فرمایا گیا ہے کہ اُن کی اچھی حالت پر تم غم نہ کھانا:

لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْکَ اِلٰی مَا مَتَّعْنَا بِہٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْھُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَیْھِمْ (الحجر۔ ۸۸) — "یہ جو ہم نے اُن میں سے کئی قسم کے لوگوں کو بہرہ مند کیا ہے تو تم اُن کی طرف نظر نہ کرو اور نہ ایسا ہو کہ تم اُن کی حالت پر غم کھانے لگو۔"

فرمایا یہ کیا کہ بھلا اگر اُنھیں "زمین" پر تھوڑی سی آسائش ملی ہوئی ہو یا اُنھیں دُنیاوی طاقت حاصل ہے تو تم کو غم کیا ہو سکتا ہے، جبکہ ہم نے تم کو ایک "زمین" کیا بلکہ ساتوں گردش کرنے والے آباد آسمان" اور وہاں تک پہنچانے والا قرآن عظیم دیا ہے؟ یہ عظمت و نعمت وہ کافر کیا دُنیا کے اور کسی بڑے سے بڑے مومن کو بھی حاصل نہیں ہوئی۔ پھر ظاہر ہے کہ جس کو "ساتوں آسمانوں" اور پوری زمین کی آبادی، "قرآن عظیم" کی پیغام رسانی کے لئے کھلے میدان کے طور پر ملی ہو، اُس کی عظمت و حشمت اور خوش بختی و نعمت یابی کا کیا کہنا ہے؟ تم ابھی بات نہ سمجھو تو نہ سمجھو مگر:۔

وَرَبُّکَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِیّٖنَ عَلٰی بَعْضٍ (بنی اسرائیل۔ ۵۵) — "تمہارا پروردگار تو اُن سب کو خوب جانتا ہے جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں۔ اور ہم بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دیتے ہی ہیں۔"

قرآن میں غور فرمائیے گا تو معلوم ہوگا کہ قرآن نے "سمٰوٰت والارض" کہہ کے ہر جگہ "زمین" کو الگ اور واحد بیان کیا ہے اور "آسمانوں" کے سات ہونے کا، متعدد طرح سے جدا ذکر کیا ہے۔ مثلاً:۔

(۱) تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ط (بنی اسرائیل ۵۔ ۱۵/۴۴)	"ساتوں آسمانوں اور زمین اور جتنے بھی اُن میں ہیں، سب اللہ تعالیٰ کے لئے تسبیح کرتے ہیں۔"
(۲) اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ہ (نوح ۱۔ ۷۱/۱۵)	"کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح اوپر تلے سات آسمان بنائے ہیں؟"
(۳) اَلَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ط (ملک ۱۔ ۶۷/۳)	"وہی ہے جس نے اوپر تلے سات آسمان بنائے۔"
(۴) وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا (النباء ۱۔ ۷۸/۱۲)	"اور ہم ہی نے تمہارے اوپر سات مہیب آسمان بنائے۔"
(۵) فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ط (بقرہ ۳۔ ۲/۲۹)	"سو درست کر کے بنایا انھیں سات آسمان۔"
(۶) فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (حٰم سجدہ ۲۔ ۴۱/۱۲)	"سو پورے کر دئے دو دن کے اندر سات آسمان اور ہر آسمان میں اس کے لئے احکام بھیج دئے۔"
(۷) وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ (مومنون ۱۔ ۲۳/۱۷)	"اور بلاشبہ ہم نے اوپر تلے سات گذرگاہیں بنائیں۔"

ہمارے نظام شمسی کا "سورج" اور اس کے تابع جو سیارے گردش کر رہے ہیں

یہ ہیں:-

(۱) سورج ______ SUN
(۲) زمین ______ EARTH
(۳) مریخ ______ MARS
(۴) عطارد ______ MERCURY
(۵) زہرہ ______ VENUS
(۶) مشتری ______ JUPITER
(۷) زحل ______ SATURN
(۸) یورانس ______ URANUS
(۹) نیپٹون یا نیپچون ______ NEFTUNE

سیاروں کی تخلیق کس طرح ہوئی؟ قرآن اشارہ کرتا ہے کہ:-

(۱) اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا — "کیا ان کافروں کو معلوم نہیں کہ سب آسمان
اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا — اور زمین ملے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے اُن کو
رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (انبیاء ۳ - ۱۷/۳۰) — جُدا جُدا کر دیا؟"

(۲) ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ — "سو آسمان کی طرف توجہ کی اور وہ دھواں تھا
وَهِىَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ — سو اُس سے اور زمین سے کہا کہ دونوں خوشی سے
ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ — آؤ خواہ ناخوشی کے ساتھ۔ اُنھوں نے کہا کہ ہم
اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ — خوشی سے آتے ہیں۔ سو ہم نے اس کے سات
سَمٰوٰتٍ (حم سجدہ ۲ - ۲۴/۱۱) — آسمان بنا دیئے۔"

یعنی پہلے نہ زمین تھی نہ آسمان تھے، صرف "دُھواں" تھا اور سورج۔ اس کے بعد سورج سے زمین کو جدا کیا گیا اور پھر ساتوں آسمان بنائے گئے۔ علماء

سائنس میں سے زیڈ بائل کا یہ جملہ قابلِ غور ہے :۔

"سیاروں کا یہ جھرمٹ یقیناً دھوئیں کے بادلوں میں لپٹا ہوا ہوگا۔"

القرآن:۔ قرآن سب ایک تھے اس کے بعد زمین قائم ہوئی اور آسمان بھی ،

علماء سائنس کہتے ہیں کہ سورج (شمس) نے آٹھ بچے دیئے جو سیاروں کی شکل میں موجود ہیں اور سب کے سب اُس کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔ پھر خود اُن بچوں کی بھی اولادیں ہوئیں۔ علماء سائنس کی دریافت یہ ہے کہ پہلے :۔

(۱) بس سورج تھا اور صرف دھواں۔

(۲) سورج نے جو بچے دئیے وہ آٹھ ہیں۔ ایک زمین اور سات آسمان

(۳) یہ سب سورج کے بچے سورج کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔

(۴) پھر ان بچوں کے بھی بچے ہوئے۔

(۵) زمین کا بچہ چاند ہے جو زمین کے گرد چکر لگا رہا ہے۔

(۶) مریخ کے دو بچے ہوئے جو مریخ کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں

(۷) اسی طرح تمام سیاروں کے متعدد بچے ہوئے جو اپنی اپنی ماؤں کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں۔

عربی زبان میں شمس (سورج) مؤنث ہے یہ عجیب اتفاق ہے۔ قرآن نے "مثانی" (گردش کرنے والے) کی کوئی تعداد مقرر نہیں کی ہے بلکہ "سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي" کہا ہے۔ یعنی "مثانی میں سے سات" دیا اس کی وجہ یہی ہے کہ گردش کرنے والے سورج کے خود آٹھ بچے ہیں اور پھر ان بچوں کی بہت سی اولادیں ہیں اور یہ سب کی سب اپنی اپنی ماؤں کے گرد چکر کاٹ رہی ہیں، گردش میں ہیں مگر بجز ان ساتوں کے اور کسی

میں زندگی نہیں ہے۔

میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ قرآن نے ہر جگہ "سمٰوٰت والارض" کہہ کے "زمین" کو الگ اور "آسمانوں" کو جدا بیان کیا ہے اب آگے ملاحظہ فرمایئے کہ "سماوات" میں سے بھی قرآن نے "سورج" اور "چاند" کو باقی ستاروں سے علیحدہ کر دیا ہے :-

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۔۔۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌ بِاَمْرِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ (نحل ۲۔ ۳۔ ۱۲)	"پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ ۔۔۔ اور اس نے مسخر کر دیا، تمہارے لئے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو اور ستارے بھی اس کے حکم سے تمہارے لئے مسخر ہیں اور بے شک اس میں عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں ۔"

اور ان سب سورج، چاند، زمین اور سبع سماوات کا معلق اور متحرک ہونا، یعنی بلا کسی ٹیک کے قائم ہونا اور مسلسل چکر کاٹتے رہنا بیان کیا گیا ہے اور اس طرح گردش میں رہنا کہ وہ ایک دوسرے سے ٹکرا نہیں سکتے :-

(۱) وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ۔۔۔ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۔۔۔ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝ (انبیاء ۳۔ ۳۱۔ ۳۳)	"اور ہم نے زمین میں پہاڑ بنائے تاکہ زمین انھیں لے کر بھاگ نہ جائے ۔۔۔ اور ہم نے آسمان کو چھت بنایا جو محفوظ ہے ۔۔۔ اور ہم نے سورج اور چاند بنائے۔ اور ہر ایک اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں ۔"
(۲) خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ	"اللہ نے آسمانوں کو بلا ستونوں کے

تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ (لقمٰن ۱۔ ۳۱/۱۰)

بنایا۔ تم اُن کو دیکھ ہی رہے ہو۔[1] اور زمین میں پہاڑ ڈال دیے تاکہ وہ تم کو لے کر بھاگ نہ جائے۔"

(۳) اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً (لقمٰن ۳۔ ۳۱/۲۰)

"کیا تم لوگوں کو معلوم نہیں کہ اللہ نے جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں سب کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے اور اس نے اپنی تمام ظاہری و باطنی نعمتیں تم پر پوری کر رکھی ہیں۔"

(۴) وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ کُلٌّ یَّجْرِیْ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی (لقمٰن ۳۔ ۳۱/۲۹)

"اور اس نے سورج اور چاند کو بھی مسخر کر دیا ہے اور یہ سب کے سب ایک مقررہ وقت تک چلتے ہی رہیں گے۔"

(۵) وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ کَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَآ اَنْ

"اور سورج اپنے مستقر کی طرف چلتا ہی رہتا ہے۔ یہ اندازہ زبردست علم والے کا قائم کیا ہوا ہے۔ اور چاند کی بھی منزلیں مقرر ہیں تا آنکہ وہ کھجور کی پرانی ٹہنی کا سا ہو جاتا ہے۔ اور سورج کی یہ مجال نہیں

---

[1] آسمان اور زمین سب بلا کسی ستون کے یعنی محض کشش پر قائم اور گردش کناں ہیں۔ اسی کو اللہ کا تھامے رہنا بھی کہا گیا ہے اور حکم سے قائم بھی:۔

(۱) اِنَّ اللّٰہَ یُمْسِکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا (فاطر ۵۔ ۳۵/۴۱)

"بلاشبہ اللہ آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے۔ تاکہ وہ اپنی موجودہ حالت کو چھوڑ نہ دیں۔"

(۲) اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ (روم ۲۔ ۳۰/۲۵)

"کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔"

تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَ لَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ط وَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (یٰسٓ ۲ - ۳۸ - ۴۰/۳۶)

کہ وہ چاند کو جا لے اور نہ رات، دن سے پہلے آسکتی ہے اور یہ سب کے سب ایک دائرے میں تیر رہے ہیں "

(۶) اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ط كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ط (رعد ۱ - ۱۳/۲)

"اللہ ہی وہ ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ستون کے قائم کر رکھا ہے تم اُن کو دیکھ ہی رہے ہو۔ پھر وہ عرش پر قائم ہوا اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا ہے اور ہر ایک اپنے مقررہ وقت تک چلتے رہیں گے۔

(۷) خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَ يُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ط كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ط (زمر ۱ - ۳۹/۵)

"اُس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا حق کے ساتھ اور وہ رات کو دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو رات پر اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا ہے یہ سب کے سب ایک مقررہ مدت تک چلتے رہیں گے "

اِن تمام آیات میں سورج کا زمین سے نکلنا، سورج اور چاند کا باقی آسمانوں سے الگ ہونا، اُن سب کا مسخر ہونا، اُن کی اپنی منزلیں مقرر ہونا، اُن کا بلا کسی ٹیک کے معلق ہونا، اُن سب کا مسلسل چکر کاٹتے رہنا اور اُن کا، دورانِ گردش میں باہم نہ ٹکرانا آپ نے ملاحظہ فرمالیا اب ایک جامع آیت ملاحظہ فرمائیے :-

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ

"کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ کے سامنے سب سجدہ ریز ہیں جو آسمانوں میں ہیں

فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ (ج ۲۔ ۱۸/۳۳) اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے بھی"

(۱) پہلے آسمانوں اور زمین کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے اور اُن سب میں "آبادیاں" ہونے اور اُن کے سجدہ ریز ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۲) پھر سورج اور چاند کو الگ الگ کر دیا گیا ہے اور اُن میں آبادی ہونے کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

(۳) پھر ستاروں کا، سورج اور چاند سے الگ کر کے ذکر کیا گیا ہے اِس سے پہلے سورہ نحل والی آیت میں بھی آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ پہلے "سمٰوات والارض" کہہ کے آسمانوں اور زمین کو جدا بیان کیا گیا ہے پھر "سمٰوات" میں سے سورج اور چاند کے مسخر ہونے کا بیان الگ اور باقی آسمانوں کے مسخر ہونے کا ذکر جدا کیا گیا ہے اور اِن "سمٰوات" کی تعداد سات بتائی گئی ہے۔ جو ساتوں آسمان ہر وقت چکر کاٹ رہے ہیں، گردش میں ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) مریخ ———— MARS

(۲) مشتری ———— JUPITER

(۳) زحل ———— SATURN

(۴) عطارد ———— MERCURY

(۵) زہرہ ———— VENUS

(۶) یورانس ———— URANUS

(۷) نیپٹون نیپچون ———— NEPTUNE

یہ سب سورج کے پیچھے ہیں۔ سورج کے ذکر میں آپ نے ملاحظہ فرما لیا ہے کہ

وہ بھی متحرک ہے۔ دورِ حاضر کے سائنسداں پہلے تو یہی نہیں مانتے تھے کہ سورج بھی متحرک ہے۔ اب کچھ لوگ جو اسکی حرکت کو تسلیم بھی کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اُس کا کوئی "مدار" نہیں ہے بلکہ وہ اپنے ہی "محور" پر چلتا ہے۔ مگر قرآن سورج اور چاند دونوں کا "مدار" یکساں ظاہر کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح چاند زمین کے گرد گھومتا ہے اُسی طرح سورج بھی کسی کے گرد گھومتا ہے۔

(۱) الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ (ابراہیم ۵۔ ۱۴/۳۳) "سورج اور چاند ایک دستور پر چل رہے ہیں"

(۲) اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ (الرحمٰن ۱۔ ۵۵/۵) "سورج اور چاند ایک حساب سے چل رہے ہیں"

سورج، روشنی دیتا ہے، ضیاء کی بارش کرتا ہے اس لئے کہ سورج خود روشن ہے اور چاند، چاندنی عطا کرتا ہے، نور پھیلاتا ہے اس لئے کہ وہ سورج سے روشنی حاصل کرتا اور آئینہ کی طرح وہ عکس زمین پر ڈالتا ہے:۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا (یونس ۱۔ ۱۰/۵) "وہ ایسا ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منور بنایا ہو"

قیامت جس عظیم حادثے کا نام ہے اُس حادثہ میں یہ سورج اور چاند جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:۔

لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ (یٰسین ۳۔ ۳۶/۴۰) "سورج کی یہ مجال نہیں کہ وہ چاند کو جا لے"

باہم اکٹھا ہو جائیں گے، ٹکرا جائیں گے:۔

فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَخَسَفَ جبکہ آنکھیں چُندھیا جائیں گی اور چاند

اَنقَمَرُوَجُمِعَ الشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُۙ	بے نور ہو جائے گا اور سورج اور چاند
یَقُوۡلُ الۡاِنۡسَانُ یَوۡمَئِذٍ	جمع کر دئیے جائیں گے، اُس روز
اَیۡنَ الۡمَفَرُّ (قیمۃ ا۔ ۹-۱۰)	انسان کہے گا کہ اب کدھر بھاگوں ؟" [1]

اسی لئے کہ اس کے بارے میں آیا ہے کہ :۔

ثَقُلَتۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِؕ	"وہ آسمانوں اور زمین کا بڑا بھاری حادثہ
لَا تَاۡتِیۡکُمۡ اِلَّا بَغۡتَةً ؕ	ہوگا اور قیامت تم لوگوں پر اچانک
(اعراف ۲۳۔ ۱۸۷)	آپڑے گی"

ظاہر ہے کہ یہ آسمان و زمین جو باہم کشش پر قائم ہیں، یکایک باہم ٹکرائیں گے اور پاش پاش ہو جائیں گے اور نظام شمسی کا خاتمہ ہو جائے گا، پھر کون اسکو ہلکا حادثہ کہہ سکتا ہے ؟

ہر کیف ! سورج کے متذکرہ بالا آٹھ بچوں میں ایک زمین بھی ہے جسکو آپ "آباد" ملاحظہ فرما ہی رہے ہیں۔ یہ ہر وقت سورج کے گرد چکر کاٹ رہی ہے، یوں کہ وہ اپنے "محور" پر بھی گھومتی ہے اور "مدار" پر بھی۔ قرآن میں گردش زمین پر متعدد آیات ہیں جن میں سے کئی آیتیں پہلے آپ کی نظر سے گذر چکیں، ان کے علاوہ بھی اور آیتیں ہیں مثلاً :۔

(۱) جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ مَهۡدًا	"تمھارے لئے زمین کو جھولا
(طٰہٰ ۲۔ ۵۳)	بنایا"
(۲) اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ مِهٰدًا ۙ	"کیا ہم نے زمین کو جھولا نہیں
(النبا ۱۔ ۶)	بنایا ؟"

---

[1] اگرچہ چاند زمین کے گرد چکر کاٹ رہا ہے اس لئے اُسے زمین سے ٹکرانا چاہیے مگر از روئے قرآن، قیامت میں چاند سورج سے ٹکرائے گا۔

"جھولا کی تعریف گردش کرنا، ہلتے رہنا ہے، گہوارہ میں بچہ اسی لئے لٹایا جاتا ہے کہ وہ گردش کے سبب سمجھے کہ ماں کی گود میں ہے۔" جھولا گردش میں نہ ہو تو وہ "جھولا" نہیں کہلائے گا۔

وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ (نحل ۲ - ۱۶/۱۵) — "اور زمین پر پہاڑ قائم کئے کہ وہ تمھیں لے کر دور بھاگے نہیں۔"

بھاگنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اگر زمین متحرک، معلق اور کشش پر قائم نہیں ہوتی، وزن کم ہوتا ہو تو زمین کو دوسرے سیارے کھینچ لیتے۔ بہرکیف! ہماری یہ متحرک زمین، سورج کا ایک بچہ ہے۔ باقی سات بچے بھی، جنھیں قرآن "آسمان" اور ہم "سیارہ" کہتے ہیں، "آبادیاں" رکھتے ہیں:۔

(۱) تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ (بنی اسرائیل ۵ - ۱۷/۴۴) — "ساتوں آسمانوں اور زمین اور جو بھی اُن میں ہیں، سب اللہ کے لئے اُس کی تسبیح کرتے ہیں۔"

(۲) اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ (حج ۱ - ۲۲/۱۸) — "کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ کے سامنے سب ہی سجدہ ریز ہیں جتنے آسمانوں میں ہیں اور جتنے زمین میں ہیں؟"

(۳) وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ (نحل ۶ - ۱۶/۴۹) — "اور چلنے والے جاندار میں سے جتنے آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اللہ کے لئے سجدہ کرتے ہیں۔"

(۴) وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ (شوریٰ ۳ - ۴۲/۲۹) — "اور آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور جتنے ان میں چلنے والے جاندار ہیں، اُن کا پیدا کرنا، اُس کی نشانیوں میں سے ہے۔"

جہانتک کہ "جانداری" کا سوال ہے، دُنیا کی ساری مخلوقِ الٰہی، "جاندار" ہے۔ مگر "دابہ" سے مراد "چلنے والے جاندار" ہیں، چاہے وہ انسان ہوں یا حیوان، قرآن کا بارھواں پارہ شروع ہی ہوتا ہے اِس آیت سے:۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ہود ا۔ ۱۱/۹) "اور کوئی چلنے والا جاندار روئے زمین پر ایسا نہیں کہ اُس کا رزق اللہ تعالیٰ کے ذمہ نہ ہو۔"

"دابہ" کی تفصیل خود قرآن یوں پیش کرتا ہے:۔

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِي عَلٰى بَطْنِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِي عَلٰى رِجْلَيْنِ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِي عَلٰى اَرْبَعٍ (نور ۶۔ ۲۴/۴۵) "اور اللہ نے ہر چلنے والے جاندار کو پانی سے پیدا کیا ہے۔ سو بعضے ان میں وہ ہیں جو اپنے پیٹ کے بل چلتے ہیں اور بعضے اُنمیں وہ ہیں جو دو پیروں سے چلتے ہیں اور بعضے اُن میں وہ ہیں جو چار پیروں پر چلتے ہیں۔"

اِس طرح کی بہت سی آیتیں ہیں جن سے "آسمانوں میں" "آبادیاں" ہونا ظاہر وثابت ہوتا ہے۔ ایک آیت یہ ہے:۔

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا (مریم ۶۔ ۱۹/۹۳) "جتنے بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں، اُن میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو نہ آئے خدا کا بندہ بن کر۔"

ظاہر ہے کہ اگر آسمانوں اور زمین کے لوگوں کو، یکساں "بندہ" بن کر خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے تو آسمانوں میں بھی زمین ہی کی طرح کی "آبادیاں" ہیں۔ ایک آیت یہ ہے:۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ "اللہ وہ ہے جس نے ساتوں آسمانوں

وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ	اور زمین سے اُن کے مثل کو پیدا کیا۔
الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ	اُن کے درمیان حکم نازل کرتا ہے تاکہ
عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ	تم جانو کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے اور یہ
قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ۠	کہ اللہ نے ہر چیز کو اپنے علم سے گھیر
(طلاق ۲۔ ۶۵/۱۲)	رکھا ہے"۔

اِس سے بھی ظاہر ہے کہ جس طرح زمین میں "آبادیاں" ہیں، ویسی ہی "آبادیاں" آسمانوں میں بھی ہیں۔

بعض لوگوں نے اِس آیت کے لفظ "مِثْلَهُنَّ" سے یہ سمجھا ہے کہ اِس آیت میں زمین کو بھی آسمانوں کی طرح سات بنایا گیا ہے۔ حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو "ارض" کو واحد استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ "ارضون" یا "اراضی" آتا دراصل اِس آیت میں ہمیں سمجھایا یہ گیا ہے کہ جس طرح زمین میں تمھاری تخلیق ہوئی ہے اور تم یہاں آباد ہو اور اللہ تعالیٰ کے انتظامی احکام زمین پر نازل ہوتے ہیں، ویسے ہی ساتوں آسمانوں میں بھی تمھاری طرح تخلیق آبادی ہوئی ہے اور اُس کے انتظامی احکام وہاں نازل ہوتے ہیں۔ آسمانوں میں زمین ہی کی طرح "آبادیاں" ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح زمین کو اپنا مُلک قرار دیا ہے، اُسی طرح آسمانوں کو بھی:۔

(۱) لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	"اُسی کا مُلک ہے سب آسمان اور
(زمر ۵۔ ۳۹/۴۴، ۵۷/۲)	زمین بھی"۔
(۲) مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ	"تو مُلک کا مالک ہے، جسے چاہے
مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ	مُلک بخش دے اور جس سے چاہے
تَشَآءُ (ال عمران ۳۔ ۲۶/۳)	مُلک لے لے"۔

وہ "ملک" ہی کیا جس میں "آبادی" نہ ہو؟ وہ "بادشاہت" ہی کیا جہاں "لوگ" نہ ہوں؟ اگر زمین "ملک" ہے اس لئے کہ یہاں "آبادی" ہے، تو آسمانوں کو بھی "ملک" نہیں کہہ سکتے جب تک کہ وہاں زمین ہی کی طرح "آبادیاں" نہ ہوں۔ بادشاہت اُسی جگہ کی جاتی ہے جہاں "آبادی" ہو۔ ایک آیت یہ بھی ہے جس سے آسمانوں یا سیاروں میں "آبادیاں" ہونا ثابت ہوتا ہے:۔

وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ‏ "اور یہ کہ وہی پروردگار ہے شعریٰ
(نجم ۳۔ ۴۹/۵۳) کا بھی۔"

شعریٰ کے بارے میں مفسرین کا بیان ہے کہ یہ ایک ستارہ کا نام ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے "ارض القرآن" جلد ۲ صفحہ ۱۸۵ میں لکھا ہے کہ عرب کے"

"بعض قبائل ستارہ پرست تھے۔ قیس جو عدنانی قبائل میں بہت بڑا قبیلہ تھا شعریٰ پوجتا تھا۔ قبیلہ کنانہ چاند کا پرستار تھا اسد کا قبیلہ عطارد کی پرستش کرتا تھا۔ تیم ستارہ دبران پوجتے تھے۔ قریش اور اُن کے دیگر ہم نسب قبائل جب ہبل کو پوجتے تھے، ہمارے قدیم علماء لغت تو کچھ نہیں بتاتے مگر حسب تحقیقاتِ موجودہ، درحقیقت ستارہ زحل تھا۔"

پھر صفحہ ۱۹۳ میں فرمایا ہے:۔

"مخصوص ستاروں کی پرستش کے متعلق اوپر گذر چکا ہے کہ مشہور قبیلہ قیس ستارہ شعریٰ کا پرستار تھا قرآن نے کہا۔ وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى اور وہی خدا شعریٰ کا رب ہے۔ قبیلہ کنانہ چاند کو، اور حمیر آفتاب کو پوجتے تھے قرآن مجید

اُن کو خطاب کرکے کہتا ہے :۔
لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ (۴۱/۳۷) "آفتاب و ماہتاب کو سجدہ نہ کرو۔"

مولر نے "انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا" میں قوم سبا پر جو مضمون لکھا ہو اس سے ظاہر ہوتا ہو کہ قدیم عرب اجرام سماویہ کی عام طور سے پرستش کرتے تھے اور جنوبی عرب کے مختلف قبائل اگرچہ مختلف دیوتاؤں کو پوجتے تھے مگر شمس اور عشتار کو تقریباً سارے عرب اپنا مشترک دیوتا مانتے تھے۔ قوم سبا کے مورث اعلیٰ کا نام ہی "عبدِ شمس" تھا اور اہلِ سبا کی دیوی شمس تھی۔ اہلِ یمن کے یہاں عشتارہ کی اہمیت زیادہ تھی۔ مولر کے نزدیک آثار و کتبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ "عشتار" اُسی سیارہ کو کہتے تھے جس کو آج "زہرہ" کہا جاتا ہے۔ ایک کتبہ میں عشتار کی ماں آفتاب کو ظاہر کیا گیا ہے۔ یعنی وہ لوگ شمس کو مؤنث اور دیوی مانتے تھے۔ قرآن میں اہلِ سبا کی آتش پرستی کا ذکر موجود ہے (۲۷/۲۴) اور عربی زبان میں شمس مؤنث بھی ہے۔

"شعریٰ" کے بارے میں تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ "شعریٰ اُس روشن ستارے کا نام ہے جسے "مرزم الجوزا" بھی کہتے ہیں۔ بعض عرب ان کی پرستش کرتے تھے"۔

فضائے بسیط میں سب سیارے ایک شاہراہ اختیار کئے ہوئے چلتے رہتے ہیں۔ منجموں نے اس شاہراہ کو بارہ منزلوں میں تقسیم کرکے ہر منزل کا نام "بُرج" اور بارہ بُرجوں کے دائرہ کا نام "منطقۃ البروج" قرار دیا ہے۔ "بُرجوں" کے حدود تمام کرنے میں اُنھوں نے مختلف شکلیں فرضی اور قیاسی ناموں سے قائم کرکے ہر منزل یعنی برج کا نام اُسی شکل پر موسوم کیا ہے

اِن برجوں میں سے ایک بُرج "جوزا" بھی ہے اُس کی شکل یوں قرار دی گئی ہے کہ دو جوڑواں لڑکے پُشت ملائے کھڑے ہیں۔ سر، دھڑ اور پاؤں تو اِن کے الگ الگ ہیں مگر کمر دونوں کی ایک ہے۔ یہ کمر ایک کمر بند کے ذریعہ بندھی ہے جس پر تین ستارے بہت روشن نظر آتے ہیں۔ جن ستاروں کے مجموعے سے یہ برج نظر آتا ہے وہ تین ستارے ایک دوسرے سے لاکھوں میل آگے اور پیچھے ہیں مگر زمین والوں کو بادیٔ النظر میں وہ چونکہ ایک ہی جگہ نظر آتے ہیں اِس لئے اُن کو جوڑواں لڑکے تصور کر کے اِس بُرج کا نام "جوزا" رکھ دیا گیا ہے۔ یہ تیسرا برج کہلاتا ہے۔ یونانی اِن جڑواں لڑکوں کو ستارہ مشتری کے دو بیٹے قرار دے کر عرصہ تک پرستش کرتے آئے ہیں۔ اب اگر ابن کثیر کا بیان درست مانا جائے کہ "عشارہ" کو "مرزم الجوزا" کہا جاتا ہے اور یونانیوں کے خیال کے مطابق "بُرج جوزا" والے دونوں لڑکے "مشتری" کے بیٹے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دراصل "عشارہ" سے مراد "زہرہ" نہیں جیسا کہ مولر کہتا ہے بلکہ "مشتری" ہے۔ بہرکیف "شعریٰ" زہرہ کا نام ہو یا مشتری کا بہرحال وہ ایک سیارہ ہی ہے۔ سورۂ نجم میں اُس کا ذکر بھی اُس کے سیارہ ہی ہونے کا اشارہ کرتا ہے اور شمس کی بیٹی ہونا بھی اُس کے سیارہ ہونے کا ہی ثبوت ہے اور اللہ تعالےٰ "شعریٰ" کا بھی اپنے کو "ربوبیت کرنے والا" کہتا ہے۔ لہذا یہ قطعی ہے کہ زہرہ ہو یا مشتری سب میں "آبادی" ہے۔ یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے۔ سی، ای، ایم جوڈ دورِ حاضر کا نامور مفکر وسائنسداں ہے وہ ہمارے نظامِ شمسی کے اِن ساتوں تابع سیاروں میں اِس وقت "آبادی" کا ہونا تسلیم نہیں کرتا۔ وہ لکھتا ہے۔

"زندگی پیدا ہونے کے لیئے لازم ہے کہ سیارہ غیر تابکار مادّے کی نسبتاً ٹھوس پپڑی سے تشکیل پذیر ہو۔ یہ پپڑی اصل میں اُس مادّے کی راکھ اور جلے ہوئے کھنگر ہوتے ہیں، جو پہلے تابکار تھا۔ گویا سیارے کو جس پر زندگی ممکن ہو، مندرجۂ ذیل شرائط پوری کرنی پڑیں گی:۔

(۱) وہ اپنے اصلی ستارے سے، جس سے وہ نور اور حرارت حاصل کرتا ہے تعلق توڑنے کے بعد خاصی مدت تک قائم رہا ہو۔

(۲) یہ اصلی ستارہ اتنا زیادہ پُرانا نہ ہو کہ نور اور حرارت نہ دے سکتا ہو

(۳) سیارہ اپنے منبعٔ نور و حرارت سے بہت زیادہ فاصلے پر نہ ہو

چونکہ۔ یہ کمیاب و نادر حالات ہمارے اپنے سیارے پر بہت تھوڑی مدت یعنی صرف ایک ارب یا شاید پچاس کروڑ سال کے لئے ہیں، اس سے یہ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُن سیاروں کی تعداد جہاں ہماری ارتقائی حالت سے ذرا بھی مشابہت رکھنے والی مخلوقات آباد ہوں، زیادہ نہیں۔ ممکن ہے ایسی مخلوق مریخ اور غالباً زہرہ میں رہتی ہوں، لیکن یہ بات ہم علم و یقین سے نہیں کہہ سکتے "

مگر آپ ان آیات پر غور فرمائیے، قرآن ان ساتوں سیاروں میں آبادی ہونے کا دعویدار ہے۔ بہرحال، ان تمام مباحث و آیات سے ظاہر ہے کہ ہمارے نظامِ شمسی میں سورج کے آٹھ بچے ہیں جن میں سے زمین کو الگ کر دیجئے تو باقی سات بچتے ہیں، جنھیں قرآن نے "سبع سمٰوٰت" فرمایا

ہے۔ ان سے مراد حسب ذیل سات سیارے ہیں :-

(۱) مریخ ———— MARS
(۲) مشتری ———— JUPITER
(۳) زحل ———— SATURN
(۴) عطارد ———— MERCURY
(۵) زہرہ ———— VENUS
(۶) یورانس ———— URANUS
(۷) نیپٹون یا نیپچون ———— NEPTUNE

ان ساتوں آسمانوں یا سیاروں میں بقول قرآن "آبادیاں" ہیں اور یہ ہر وقت سورج کے گرد چکر کاٹتے اور گردش کرتے رہتے ہیں اور میری فکر یہ ہے کہ "سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ" سے مراد نظام شمسی کے یہی سات آبادیاں رکھنے والے اور ہر وقت گھومتے رہنے والے سیارے ہیں۔ انکی مسلسل گردش اور پیہم حرکت کے سبب ان کو "مثانی" کہا گیا ہے۔ "مثانی" یعنی گردش کرنے والے سیاروں کی تعداد اس لئے مقرر نہیں کی گئی کہ اور بھی بہت سے تابع سیارے جو سورج کے ان آٹھوں بچوں کی اولاد ہیں اپنی اپنی ماؤں کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں۔ مثانی میں سے سات (سبعاً من المثانی) کی قید اس لئے لگائی کہ تمام گردش کرنے والے سیاروں میں سے صرف ان ہی سات سیاروں میں آبادیاں ہیں چونکہ رسول اللہ صلعم آخری نبی اور قیامت تک کے لئے خدا کا پیغام، انکے سارے بندوں کو پہنچانے والے رسول تھے اس لئے اُن کو ساتوں آسمانوں کے دیے جانے (اتینٰک) کا مطلب قرآن کی تعلیمات کو

اِن آسمانوں کی آبادیوں تک پہنچانے کے لئے دیا جاتا ہے۔ قرآن کو یہاں منفرد طریقے پر " قرآن عظیم " اِسی لئے کہا کہ اُسے زمین اور ساتوں آسمانوں (سَبْعِ سمٰوٰت والارض) تک پہنچنا ہے۔ اس ایک مقام کے علاوہ اور کسی جا "قرآنِ عظیم" کا لفظ نہیں آیا ہے " مثانی " یعنی گردش کرنے والوں میں سے " سورج " اِس لئے چھٹ گیا کہ وہ سراسر آتشِ سوزاں ہے۔ " چاند " اس لئے کٹ گیا کہ وہ مطلقاً خشک بیابان ہے۔ وہاں نہ حرارت ہے نہ ہوا اور نہ پانی۔ اور یہ تینوں چیزیں حیات اور زندگی کے لئے ضروری اور لابدی ہیں۔ اور دوسرے وہ تمام تابع سیارے بھی جو اور سیاروں کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں، سب کے سب بنجر اور غیر آباد ہیں[۱]۔ خود زمین " اس لئے خارج از بحث تھی کہ یہ قصہ زمین ہی کا تھا اور اُس کے ہر ہر خطہ پر لاتعداد رسول آچکے تھے۔ زمین پر پیغام رسانی کی فضیلت ایسی نہ تھی جو صرف رسول اللہ کو ملی تھی یا بطور

---

[۱] عطارد، سورج سے بہت قریب ہے اس لئے وہ بہت گرم سیارہ ہوگا اور یہ شک ہوسکتا ہے کہ وہاں آبادی نہ ہو مگر جب زمین خود دہکتی ہوئی آگ تھی تو اس میں ایک مخلوق آگ ہی سے پیدا ہوئی تھی اِسی سورۂ الحجر ہی میں ہے کہ

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ	بلاشبہ ہم نے انسان کو بجتی ہوئی مٹی سے بنایا جو سڑے
حَمَإٍ مَّسْنُونٍ وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِن	گارے کی تھی اور اس سے پہلے ذکی آگ سے
قَبْلُ مِن نَّارِ السَّمُومِ (۱۵ / ۲۶-۲۷)	جنوں کو پیدا کر چکے تھے "

بعض سائنس داں چاند میں بھی آبادی محسوس کرتے ہیں۔ بہرحال اس سے میری تحقیق میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ چاہے عطارد میں آبادی نہ ہو اور چاند میں ہو یا چاند میں نہ ہو اور عطارد میں ہو، آبادی والے سات ہی سیارے ہیں جو گردش کناں ہیں۔ اب وہ ساتواں آباد آسمان یا سیارہ چاہے عطارد ہو یا چاند۔

خاص قابلِ ذکر تھی۔ لہذا "مثانی" میں سے صرف وہی "سبع سموٰت" یعنی ساتوں آسمان" رسول اللہ صلعم کو پیغام رسانی کے لئے عطا ہوئے جو "آبادیاں" رکھتے ہیں جن میں "زندگیاں" ہیں، جن میں خدا کے ایسے بندے آباد ہیں جن کو قانونِ الٰہی کی ضرورت ہے اور جو پیغام الٰہی سن اور قبول کر سکتے ہیں۔

"سبع سموٰت" رسول اللہ کو دینے کا اہم مسئلہ اس لئے پیش آیا کہ آپ آخری "نبی" تھے اور اُن کا لایا ہو قرآن "خدا کا آخری پیغام" تھا اور "ہر طرح محفوظ و غیر محرّف صحیفۂ آسمانی" تھا۔ یعنی آپ:۔

(۱) خَاتَمَ النَّبِیّٖن (۳۳/۴۰) "نبیوں کے عہدہ کو ختم کر دینے والے

(۲) رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْن (۲۱/۱۰۷) "ساری دُنیاؤں کے لئے رحمت"

بن کر آئے تھے اور جو "کتاب" لائے تھے وہ:۔

ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْن (۱۲/۱۰۴) "ساری دُنیاؤں والوں کے لئے نصیحت" تھی۔ اور جس نے اس کتاب اور رسول کو بھیجا تھا وہ تھا:۔

رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (۱/۵) "ساری دنیاؤں والوں کا رب"

اب اگر رسول کو بھی وہ "سبع سموٰت" جو آبادیاں رکھتے ہیں، خدا کا صحیح صحیح اور پورے کا پورا پیغام پہنچانے کے لئے عطا نہ کئے جاتے تو زمینی انسانوں کے ساتھ اس نصیحت نامہ کا "آسمانوں" پر جانا ہی غلط ہو جاتا۔ اور اگر آنحضرت کے لئے بھی صرف "زمین" ہی تک "پیغام رسانی" محدود کر دی جاتی جیسا کہ دوسرے نبیوں کے ساتھ ہوا تھا تو اُن "ساتوں آباد آسمانوں" کے لئے دوسرے پیغمبر کو مبعوث کرنا پڑتا۔ اور اگر ایسا کیا جاتا تو چونکہ اِن آباد سیاروں یعنی ساتوں آسمانوں کا تعلق زمین سے قائم ہوگا، لہذا رسول اللہ کی وہ پوزیشن باقی نہ رہتی جس پر آپ فائز کئے گئے تھے۔ یعنی نہ تو آپ "خَاتَمَ النَّبِیّٖن"

ہی کہلا سکتے تھے، اِس لئے کہ آپ کے بعد وہ رسول آنا اور نہ آپ رحمۃ للعلمین" ہی ہو سکتے تھے کیوں کہ" زمین" واحد ہے، صرف ایک "عالَم" ہے۔ یہ مرتبہ آپ کا جب ہی قائم و باقی رہ سکتا تھا جبکہ ایک عالم (زمین) کے علاوہ دوسرے اور سب عالم (ساتوں آباد آسمان) بھی "پیغام رسانی" کے لئے آپ کو عطا کئے جائے۔ لہٰذا:-

رَبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (۸۶/۲۳)

نے اپنے آخری نبی کو بشارت دی کہ:-

اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمِ (۸۷/۱۵)

اِس طور پر اب قرآن کے اوّلین مخاطب اہلِ ارض جب جہاں بھی جائیں گے جس آباد کرّے سے بھی رابطہ قائم کریں گے، اُن کے ساتھ وہاں" رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ کا نازل کیا ہوا" رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" کا لایا ہوا یہ" ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ" اُن کے ساتھ جائے گا اور یہ سرچشمۂ ہدایت" قُرْاٰنَ الْعَظِيْمِ" جب بھی جہاں بھی اور جس صورت سے بھی پہنچے گا، وہ رسول اللہ ہی کا پہنچایا کہلائے گا حب ہی تو بزبانِ وحی، آپ کا اعلان تھا کہ:-

وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ (انعام ۲- ۱۹/۷)

"اور مجھ پر یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ میں تم لوگوں کو ڈراؤں اور جس جس تک یہ ہو پہنچے"

"مَنْۢ بَلَغَ" ایک انتہائی بلیغ ولا متناہی جملہ ہے۔ یہ" زمین" سے آسمانوں تک حاوی ہے۔ یہ سلسلہ یوں قائم ہے اور چلتا رہے گا کہ:-

الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ

"رسول تم لوگوں کے لئے گواہ بنے ہیں اور تم لوگ گواہ، شاہد، بنو دوسرے

(حج ۱۰ ۲۲/۴۷) لوگوں کے لئے"

سائنسدانوں کو شک ہے کہ ممکن ہے اہلِ مریخ یا دوسرے آسمانوں کی آبادیاں، علم و عقل یا حکمت و سائنس میں، زمین والوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہوں اور وہ بھی زمین پر قبضہ کرنے کی فکر و سعی میں ہوں۔ قرآن نے جب ان آبادیاں رکھنے والے ساتوں آسمانوں کی ہدایت کو "نبیِ آخر" سے وابستہ کر دیا ہے اور ان آسمانوں میں ذکر و بصیرت کے لئے قرآن، زمین سے پہنچنے والا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ مریخ یا دوسرے آسمانوں والے زمین کے انسانوں سے علم و حکمت میں آگے بڑھے ہوئے ہرگز نہیں ہیں بلکہ وہ زمینی ہدایت کے محتاج ہیں۔ اُن میں علم و حکمت کا رواج اور شوق زمینی انسانوں کے ذریعہ پیدا ہوگا۔ یہ ہے میرے نزدیک سورہ الحجر والی آیت "سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي" کا وہ مفہوم جو میں نے، اسے "آیاتِ کائنات" سے متعلق کر کے مقالہ کے شروع میں بتایا تھا اور یہ ہیں وہ نتائج جن کے بارے میں ابتداً میں نے عرض کیا تھا۔ میں نے اسے جیسے اور جو کچھ سمجھا تھا عرض کر دیا۔ آپ کو میرے خیال کے مان ہی لینے کی مجبوری اور پابندی نہیں مگر قرآن میں غور و خوض اور تدبّر و تفکر آپ کا قطعی فرض ہے۔ لہٰذا آپ خود بھی سنجیدگی کے ساتھ اس عنوان پر تلاش و جستجو کریں۔

قرآن نے ارض (زمین) اور سمٰوٰت (آسمانوں) پر جس قدر زور دیا ہے اور لوگوں کے غور و فکر کے لئے جس انداز سے اُس کی اہمیت جابجا بار بار ظاہر کی ہے، میرا خیال ہے کہ دوسرے موضوع پر ایسا نہیں کیا ہے۔ دو چار آیتیں ملاحظہ فرمالیجئے:-

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ "بلا شبہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق

وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (آل عمران ۲۰ - ۱۹۰ - ۱۹۱)

اور لیل و نہار کے اختلاف میں عقل و دانش والوں کے لئے بڑا سبق ہے۔ جو لوگ کہ اُٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے "خدا کی یاد کرنے والے اور آسمان اور زمین کی تخلیق پر غور و فکر کرنے والے ہیں، کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! تُو نے اس کو فضول اور لایعنی ہرگز پیدا نہیں کیا ہے۔"

غور تو فرمائیے، لگاتار دو آیتوں میں تخلیقِ ارض و سموات پر غور و فکر کا ذکر ہے۔ آپ اس آیت کو پڑھیے اور دورِ حاضر کے مشہور سائنسداں "آئن اسٹائن" کا یہ قول ملاحظہ فرمائیے :-

"وہ انسان، جو کائنات پر اظہارِ حیرت کے لئے ٹھہرتا نہیں اور اُس پر خشیت و تقویٰ کی کیفیت طاری نہیں ہوتی، حقیقتاً مر چکا ہے اور اُس کی آنکھیں بصارت سے محروم ہو چکی ہیں۔"

اسی "سبع مثانی" والی آیت سے ایک آیت پہلے والی آیت کی ابتداء یوں ہوئی :-

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ (الحجر ۱۵ - ۸۵)

"اور ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور اُن کو جو اِن کے درمیان ہیں، فضول پیدا نہیں کیا ہے۔"

سورۂ انبیا کی ایک آیت میں آسمانوں اور زمین اور اُن کے درمیان کی چیزوں کی تخلیق کے سلسلے میں فرمایا گیا ہے کہ یہ ہنسی مذاق نہیں بلکہ بڑی اہم حیثیت رکھتی ہیں :-

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِيْنَ ۝ لَوْ أَرَدْنَا أَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا ۖ إِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝ (انبیاء ۲۔ ۲۱ / ۱۶ - ۱۷)

"اور ہم نے آسمان و زمین اور جو اُن کے درمیان ہیں یوں نہیں پیدا کیا کہ ہم فعل عبث کرنے والے ہوں۔ اگر ہم کو کھیل ہی کرنا منظور ہوتا تو ہم ایسا، اپنی ذات ہی سے حاصل کر لیتے مگر ہم ایسا کرنے والے نہیں ہوئے۔"

سورۂ دخان (بھاپ، اسٹیم، گیس) کی ایک آیت ہے:۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِيْنَ ۝ وَمَا خَلَقْنٰهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (دخان ۲۔ ۴۴ / ۳۸ - ۳۹)

" اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو اُن کے درمیان میں ہیں، تفریحاً نہیں پیدا کر دیا ہے۔ اور ہم نے اُنھیں نہیں پیدا کیا مگر حق کے ساتھ، مگر اکثر لوگ بات ہی نہیں سمجھتے۔"

اس آیت کی عظمت سے مسلمان بے خبر ہوں تو ہوں مگر ایک عیسائی کہتا ہے:۔

"جوں جوں ہمارا علمِ فطرت بڑھتا جاتا ہے، ہم محسوس کرتے ہیں کہ ابھی بہت کچھ اور ہے جسے جاننا چاہیئے۔ مطالعۂ کائنات پر صرف کیا ہوا ہر لمحہ، ہمیں کیف و مستی کا پیغام دیتا ہے۔"

قرآن کے اوّلین مخاطب اہلِ عرب تھے۔ اُنھوں نے اس دعوت کو قرار واقعی اہمیت دی تھی۔ پہلی صدی تو اُن کی استحکامِ حکومت میں صرف ہوئی مگر دوسری صدی سے اُنھوں نے فلکیات کی طرف توجہ شروع کر دی تھی۔ علامہ شبلی نعمانی نے "المامون" میں لکھا ہے:۔

"دولتِ اسلامیہ میں اوّل جس نے رصدگاہ کی بنیاد ڈالی اور بیش بہا آلات رصد مہیا کئے، وہ یہی نامور خلیفہ مامون (۱۹۸ھ / ۸۱۳ء تا

۲۱۸ھ) ہے، کہ اس کام کے لئے اُس نے علاوہ اُن لوگوں کے جو دربار میں تھے، تمام ممالک محروسہ سے ہیئت و ہندسہ کے ماہرین فن طلب کئے اور ۲۱۴ھ میں بمقام شماسیہ، عظیم الشان رصد گاہ قائم کیا جس کے مہتمم یحییٰ بن ابی المنصور، راس المنجمین خالد بن عبدالمالک مروزی، سند بن علی، عباس بن سعید جوہری اور چند ریاضی داں علماء تھے۔ نہایت بیش بہا آلاتِ رصدیہ مہیا ہوئے اور آفتاب کے میل کا مقدار، اُس کے مرکز دل کا خروج و اوج کے مواضع اور چند سیارات و ثوابت کے حالات دریافت کئے گئے"۔

اِس سے پہلے ہی مسلمانوں میں علم ہیئت و سائنس کا اس قدر رواج اور شوق پیدا ہو چکا تھا کہ حکم بن ہاشم نے جو ابن عطا اور المقنع کے نام سے مشہور ہے سائنس اور حکمت میں اس قدر مہارت پیدا کر لی تھی کہ اُس نے ایک مصنوعی چاند بنایا تھا جو "ماہِ نخشب" کے نام سے بہت مشہور ہے۔ یہ چاند ایک کنویں سے طلوع ہوتا تھا اور بلند ہو کر ٹھہر جاتا تھا اور اِس سے کافی روشنی ہوتی تھی جو بہت دور تک چاروں طرف پھیلتی تھی۔ چونکہ یہ حیرت انگیز سائنسی کرشمہ تھا لہٰذا عام انسان اُس کو "خدا" سمجھنے اور ماننے لگے تھے۔ اس لئے خلیفہ مہدی نے اُس کے خلاف فوج کشی کی تھی اور بالآخر ۱۶۳ھ "المقنع" نے آگ میں کود کر خودکشی کر لی تھی۔ محققین کا کہنا ہے کہ ۱۵۰ھ ہی سے مسلمانوں نے علم الافلاک اور علم ہیئت میں بڑی شدت سے دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ تا آنکہ عہد مامون میں یہ علم اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ مگر پھر آہستہ آہستہ یہ علم مسلمانوں سے دور ہوتا چلا گیا۔

عہدِ حاضر میں اِس علم نے غیر مسلموں کے ہاتھوں عروج پایا ہے۔

کرۂ ارض سے باہر نکلنے اور دوسرے کروں یا آسمانوں میں داخل ہو جانے کے لئے انسانی کوششیں فکر و جستجو سے آگے بڑھ کر عملی شکل اختیار کرنے لگی ہیں۔ ان کی کوشش "مریخ" پر جانے کی ہے جو زمین سے قریب ترین آباد سیارہ یا آسمان ہے۔ اور اس سفر کے لئے چاند کو اسٹیشن بنانے کا خیال ہے۔ امریکہ کے آرمی آرڈیننس گائڈ کے ٹیکنیکل ڈائرکٹر ڈاکٹر ردینوفادل نے ۱۹۵۵ء میں کہا تھا کہ ۱۹۸۰ء تک یقیناً انسان اس قابل ہو جائیں گے کہ "چاند" میں پہنچ جائیں۔ کچھ دنوں کے بعد ڈاکٹر فال براؤن نے اعلان کیا کہ ۱۹۷۷ء تک زمین کے سائنسدان چاند پر اُتر جائیں گے۔ ۱۹۵۱ء میں کیتھ وکیم گاٹ لینڈ نے اندازہ لگایا تھا کہ پانچ سال کے اندر انسان اس قابل ہو جائیں گے کہ زمین سے تقریباً .. ۵ میل کی بلندی پر خلا میں ایک مصنوعی سیارہ قائم کریں۔ پھر میری لینڈ کے پروفیسر فریڈ لنگر نے ۱۹۵۵ء میں اعلان کیا کہ امریکہ دو سال کے اندر ایک ایسا مصنوعی سیارہ زمین کی کشش سے باہر بھیج دے گا جس سے موسمی کیفیات اور فضائی اثرات کا پتہ چلے گا مگر یکایک ۴ر اکتوبر ۱۹۵۷ء کو روس نے ایک مصنوعی سیارہ کو کامیاب راکٹ کے ذریعہ خلا میں چھوڑ دیا جسے روسی زبان میں اسپوٹنک (SPUTNIK) کہا جاتا ہے اس کے بارے میں روس کا اعلان تھا کہ :-

"یہ مصنوعی تابع سیارہ جو سوویٹ قوم نے بنایا ہے، محض پُر اسرار بلند فضا میں چکر ہی نہیں لگا رہا ہے بلکہ کام بھی کر رہا ہے اور وہاں جہاں فضائی کشش کا قانون اب نہیں چلتا اور جہاں سے ہماری زمین ایک چھوٹا سا کرہ معلوم ہوتی ہے، یہ جو کچھ دیکھتا اور معلوم کرتا ہے، اس سے ہمیں مطلع کرتا ہے۔

پُرانے اور نئے ماہرین علم ہیئت و سائنس نے جو کچھ خواب دیکھے تھے، خیالی پرواز کرنے والوں نے جو کچھ تمنائیں کی تھیں اور فضائی پرواز کے ماہرین نے جو کچھ سوچ بچار پر وقت صرف کیا تھا، وہ سب کچھ آج حقیقت بن گیا۔

ہمارے لئے یہ مصنوعی چاند[1]، محض ایک دھات کا گولہ نہیں ہے، نہ صرف ایک سائنسی آلہ یا اشارہ دینے اور ریکارڈ کرنے والی مشین یا پرواز کرنے والی رصدگاہ ہے۔ ہمارے لئے یہ مصنوعی چاند، مشکل تحقیقاتوں اور انکشافوں کا ایک تفصیلی بیان اور عقل پر فرسودہ بدی اور ستمگاری کی افسوسناک گرفت کا افسانہ اور آزادی کی دُنیا میں ذہانت و علم کی فتح ہے۔

یہ دھات کا گولہ جس کا قطر صرف ۸۵ سینٹی میٹر (تقریباً ۲۳ انچ) اور وزن صرف ۸۳٫۶ کیلو گرام (تقریباً ۱۸۵ پونڈ) ہے ایک نئے دَور کا آغاز کرتا ہے۔ اور اب وہ دن دور نہیں جب کائناتی خلا میں، انسان کی پرواز اور سیّاروں پر ورود، ایک حقیقت بن جائے گا۔

مصنوعی تابع سیارہ بہت سے اُن پیچیدہ مسائل کے حل کرنے میں مدد کرے گا جو خلا کی اوپری تہوں سے، اور انسان کو جس حد تک خلائے بسیط کا علم ہے، اس کے آگے کے سرحدی علاقوں سے اور کائناتی خلا کی وسعتوں سے متعلق ہیں۔

---

[1] اِسے "چاند" اس رعایت سے کہا جاتا ہے کہ جس طرح چاند زمین کا تابع سیّارہ ہے اُسی طرح یہ مصنوعی سیارہ بھی زمین کے گرد چکر لگا رہا ہے۔

خلا کی اوپری تہیں، زمین سے تقریباً آٹھ دس کلیومیٹر کی بلندی سے شروع ہوتی ہیں۔ صرف سو کیلومیٹر کی بلندی پر ہوا کا ثقل ۱/۱ لاکھ رہ جاتا ہے اور پانچسو کیلومیٹر کی بلندی پر ۱/۱ کھرب رہ جاتا ہے لیکن مصنوعی گیسوں کا یہ غلاف اتنی بلندی پر بھی تحفظ زندگی کا ایک اہم ترین فرض انجام دیتا ہے خلا کی اوپری تہوں میں انتہائی پیچیدہ طبعی کیمیائی عمل و ردِ عمل وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں جو آفتابی و کائناتی شعاعوں نیز چھوٹے چھوٹے جسیموں میں ایسا تغیر و تبدل کرتے رہتے ہیں کہ جب یہ سطح زمین تک پہونچتے ہیں تو حیاتِ نامی کے لئے بے ضرر ہو جاتے ہیں۔

مصنوعی تابع سیارے نے خلا کی اوپری تہوں اور کرۂ ارض کی قریب ترین فضاؤں کا مطالعہ کرنے کے روشن امکانات پیدا کر دئے ہیں۔ ۔۔ ۔۔ مصنوعی سیاروں کی مدد سے مشاہدات کا جو پروگرام بنایا گیا ہے وہ بہت ہی وسیع ہے، جس میں فضا کی اوپری تہوں کی طبیعیات کی بہت سی شاخیں اور زمین کے گرد کائناتی خلا کا مطالعہ شامل ہیں۔ ان مسائل میں برق پاروں کے کرے کی حالت کا مطالعہ، اس کی کیمیائی ساخت، دباؤ اور ثقل کی تبدیلیاں، مقناطیسی پیمائشیں، کاسمک شعاعوں کی ہئیت کا مطالعہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان بہت سے سوالوں پر یہ پہلا مصنوعی سیارہ ہی کافی معلومات فراہم کرے گا۔ مصنوعی سیارہ کائناتی خلا کی تسخیر میں پہلا قدم ہے سودیٹ یونین ایسے مصنوعی سیارے بھی چھوڑے گا جس میں جانور ہوں گے تاکہ فضا میں اڑان کے دوران، جانوروں پر جو ردِ عمل ہو۔ اُسے معلوم کیا جا سکے۔"

چنانچہ ۳ نومبر ۱۹۵۷ء کو سوویت یونین نے دوسرا مصنوعی سیارہ بھی چھوڑ دیا جس میں "لائیکا" نام کی ایک "کتیا" بھی تھی پہلے اسپوٹنک کا وزن ۱۸۴ پونڈ تھا، دوسرے اسپوٹنک کا وزن ۱۱۲۰ پونڈ سے زیادہ ہے۔ پہلے اسپوٹنک کا قطر ۸ء ۲۲ انچ تھا لیکن دوسرے کا قطر ۵ فٹ ہے۔ یہ دوسرا مصنوعی سیارہ پہلے مصنوعی سیارہ سے چھ گنا وزنی ہے اور سطح زمین سے ایک ہزار میل سے بھی زیادہ بلندی پر ایک گھنٹہ ۴۲ منٹ فی چکر کے حساب سے زمین کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ یہ مختلف قسم کے آلات اور ساز و سامان سے لیس ہے جو روسی سائنسدانوں کو "کوڈ زبان" میں قیمتی معلومات ترسیل کر رہا ہے۔ اقبال نے غلط نہیں کہا تھا کہ:۔

دگرگوں جہاں، اُنکے زورِ عمل سے — بڑے معرکے زندہ قوموں نے مارے
منجم کی تقویمِ فردا ہے باطل — گرے آسماں سے پرانے ستارے

لوگ ۱۹۵۷ء میں "انقلاب" کے منتظر تھے کہ دیکھیے کس شکل میں انقلاب رونما ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ "سن ستاون" تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ان سالوں میں یا تو ایسی فیصلہ کن لڑائیاں لڑی گئی ہیں یا ایسے سیاسی و سماجی انقلابات آئے ہیں، جنھوں نے انسان کو ایک نئی زندگی اپنانے پر مجبور کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء میں ڈاکٹر لاینوِنگ اسٹون نے افریقہ میں جھیل جلوہ تلاش کیا تھا اور اسی سال فرانس میں لورڈز کے معجزاتی چشمے منظرِ عام پر آئے تھے۔ اس لحاظ سے ۱۸۵۷ء کا سال تہذیبی ترقی کے لئے بلاشبہ بڑی اہمیت رکھتا تھا مگر ۱۹۵۷ء بھی تہذیبی ترقی کے لئے کچھ کم نہیں بلکہ زیادہ ہی مبارک ثابت ہوا۔ اسی سال "جیو فزیکل سال" منایا گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ بڑے بڑے سائنسدان

کائنات کے سربستہ رازوں کی کھوج کریں۔ اور اسی سال روس نے غیر فوجی فضا پیمائی میں اپنا جدید ترین جٹ ہوائی جہاز ٹی۔ یو ۱۱۴ پیش کیا جس کو دنیا نے حیرت بھری مگر تحسین آمیز نظروں سے دیکھا اور اسی سال روس ہی نے اپنا "مصنوعی چاند" بھی فضا میں چھوڑا جو انسانی علم و حکمت کا ایک نادر کرشمہ ہے۔ واقعی سوچیے تو کیا یہ دنیا میں عجیب و غریب انقلاب کا پیش خیمہ نہیں؟ جو چیز سب سے زیادہ لوگوں کے لئے حیران کن ہوتی وہ اس دوسرے مصنوعی سیارے کا غیر معمولی وزن اور اس وزنی سیارہ کو اتنی بلندی تک پہنچانے والی لا انتہا قوت ہے۔ ایک پونڈ وزنی چیز کو بلندی پر پہنچانے کے لئے ایک ہزار پونڈ عام ایندھن کی قوت درکار ہے۔ اور یہ دوسرا روسی مصنوعی سیارہ جو "۱۱۲۰" پونڈ سے بھی زیادہ ہی وزنی ہے۔ اس کے لئے دس لاکھ پونڈ عام ایندھن سے زیادہ قوت درکار ہے اور جس بلندی پر روس کا یہ مصنوعی سیارہ چکر کاٹ رہا ہے، زمین سے اُٹھا کر اتنے وزن کو اتنی بلندی پر پہنچانے کے لئے پندرہ لاکھ پونڈ کی قوت مطلوب ہے۔ پھر وہ کونسی غیر معمولی قوت ہے جس سے روسی سائنسدانوں نے کام لیا؟

سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ اگر اس دوسرے مصنوعی سیارہ یا اسپوٹنک ۲ کا ایک بڑا حصہ بھی ایندھن کی قوت میں بدل جائے تو کم سے کم ۸۰ پونڈ کا مصنوعی سیارہ سیدھا چاند پر اُتر سکتا ہے اسی طرح جس زبردست راکٹی قوت نے اسپوٹنک ۲ کے ۱۱۲۰ پونڈ وزن کو زمین سے اُٹھا کر ایک ہزار میل کی بلندی پر پہنچایا ہے، وہی راکٹی قوت ۱۱۲ پونڈ وزن کے راکٹ یا سیارہ کو براہ راست چاند تک پہنچا سکتی ہے۔

امریکہ کی طرح روس نے کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ وہ کامیاب

راکٹ کے ذریعہ خلا میں "مصنوعی چاند" چھوڑ کر سائنس کی دنیا میں تہلکہ مچا دے گا۔ برخلاف اس کے امریکہ عرصے سے اپنی سائنسی برتری و مہارت کے نعرے لگا لگا کر ایسے مصنوعی چاند اڑانے اور نظام شمسی کے دوسرے سیاروں تک پہنچنے یا اس پر اترنے کا اعلان کر رہا تھا کہ یکایک علی الترتیب ۴ر اکتوبر اور ۳ر نومبر ۱۹۵۷ء کو دو روسی اسپوٹنکوں کی کامیاب پروازنے امریکہ میں قیامت برپا کر دیا۔ کیونکہ نہ صرف اس بارے میں روس نے تمغۂ اولیت حاصل کر لیا تھا بلکہ امریکہ پر روس کی سائنسی برتری بھی دنیا پر آشکار ہو گئی تھی۔ چنانچہ امریکی سائنسدانوں نے بڑی کوشش کر کے ۶ر دسمبر ۱۹۵۷ء کو پہلا اور ۴ر جنوری ۱۹۵۸ء کو دوسرا امریکی مصنوعی سیارہ فضا میں چھوڑنے کی کوشش کی مگر دونوں مرتبہ ناکامی ہوئی۔ امریکی راکٹ راستے ہی میں جل جل کر تباہ ہو گیا۔ اس حادثہ پر دہلی کے ہفت روزہ طبی رسالہ " ہمدرد" مورخہ ۱۵ر جنوری ۱۹۵۸ء میں ایک خوبصورت لطیفہ چھپا کہ:-

سوال:- امریکہ اور روس کے طفیلی سیاروں میں کیا فرق ہے؟

جواب:- امریکہ کا طفیلی سیارہ اوپر نہیں جائے گا اور روس والا نیچے نہیں آئے گا۔

مشہور امریکی اخبار "میڈیسن کیپٹل ٹائمز" نے بھی رنجش کا اظہار یوں کیا:-

"ہمیں امید ہے کہ ہراول کو چھوڑنے کی کوشش ناکام ہونے پر جو گڑبڑ پھیلی ہے، اس سے اس ملک کو اور خاص طور سے اُن لوگوں کو جو واشنگٹن میں اونچی اونچی گدیوں پر جلوہ افروز ہیں خاکساری کا سبق ملے گا جس کی اشد ضرورت ہے۔ انھیں یہ سوچنے کی عادت چھوڑ دینی چاہیئے کہ ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں

اس لئے کہ ہم امریکن ہیں :۔

مگر جو لوگ مسلسل سعی و کوشش میں لگے رہتے ہیں بالآخر کامیابی اُن کے قدم چومتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کی سعی و محنت تو ضائع کرتا ہی نہیں :۔

اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی

" میں کسی کام کرنے والے کے عمل کو اکارت نہیں کرتا خواہ وہ مرد ہو یا عورت "

چنانچہ ۳۱ر جنوری ۱۹۵۸ء کو امریکی سائنسدانوں نے جو تیسرا راکٹ داغا اُس کی پرواز کامیاب رہی اور پہلا امریکی ننھا چاند ، زمین کے چاروں طرف گردش کرنے لگا۔ اس کے بعد ۱۷ر مارچ اور پھر ۲۶ر مارچ ۱۹۵۸ء کو دوسرا اور تیسرا مصنوعی امریکی سیارہ بھی فضا میں چھوڑا گیا جو کامیاب ہوا۔ ہرچند کہ ان تینوں امریکی راکٹوں نے پرواز میں کامیابی حاصل کر لی اور تین امریکی مصنوعی چاند ، زمین کے گرد چکر لگانے لگے مگر وزن کے اعتبار سے تینوں " امریکی مصنوعی سیارے نہایت حقیر ہیں ، روسی سیارے ان سے کہیں زیادہ وزن دار ہیں۔ امریکہ نے یہ بھی اعلان کیا کہ وہ ایسا مصنوعی چاند فضا میں بھیجے گا جو چاند سے آگے جاکر سورج کا تابع سیارہ بنے گا ، چنانچہ ۱۹ر دسمبر ۱۹۵۸ء کو امریکہ نے اس ارادہ سے ایک راکٹ داغا مگر وہ زمین کی کشش سے بھی باہر نہ جا سکا اور صرف ۷۹ ہزار میل دور جاکر تباہ ہو گیا اس کی عمر خود امریکی سائنسدانوں کے بیان کے مطابق صرف بیس دن تھی مگر یہ سیارہ یہ عمر بھی نہ پا سکا۔ ۲ر جنوری ۱۹۵۹ء کو روس نے بغیر کسی اعلان ما قبل کے جو راکٹ داغا وہ اپنے سیارے کو چاند سے آگے لے جانے میں پورا پورا کامیاب رہا اور یہ چوتھا روسی اسپوٹنک ، سورج سے نو کروڑ میل دو



۲ر جنوری ۱۹۵۹ء سے ہمارے سورج کا پہلا تابع سیارہ بن کے گردش کر رہا ہے اور تقریباً ۱۵ مہینوں میں سورج کے گرد اپنا چکر پورا کرے گا۔ امریکہ نے بھی ۳ر مارچ ۱۹۵۹ء کو جو دوسرا راکٹ داغا وہ کامیاب رہا اور امریکی مصنوعی سیارہ چاند سے گذر کر سورج کے گرد گھومنے لگا۔ ہر چند کہ چاند سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کامیاب رہی ہے اور روس و امریکہ دونوں نے سائنسی طاقت کی عظمت ظاہر کر دی ہے مگر دراصل اب کسی مصنوعی سیارہ کو چاند تک پہنچا دینے یا چاند سے آگے روانہ کر دینے کا مسئلہ اس قدر اہم نہیں بلکہ اصل چیز ہے زمین اور چاند پھر چاند اور سورج کے درمیان کے لاتعداد طبیعاتی مظاہر کی دریافت اور فضا کی اوپری تہوں کے عجیب و غریب لامعلوم اثرات اور اُس کے گوناگوں خواص کی تحقیقات اور کائناتی شعاع ریزی کی مختلف نوعیت کی معلومات کا حصول —— نیز مصنوعی چاند کا محض چاند تک پہنچا دینا اب کوئی خاص کارنامہ نہیں بلکہ اُنھیں کامیابی کے ساتھ زمین پر واپس لانے کا مسئلہ اہم ہے[1]، کیوں کہ اگر ایک انسان زمین سے چاند پر جائے تو دیکھنا یہ ہے کہ وہ پھر زمین پر کس طرح واپس آئے گا؟ کائناتی شعاع ریزیوں کے اثرات سے

---

[1] روسی سائنسدانوں کو اپنے دونوں اسپوٹنکوں کی کامیاب پرواز کے ذریعہ جو کچھ تجربات اور علوم حاصل ہوئے اُن کی بنا پر انھوں نے ۲۱ فروری ۱۹۵۸ء کو سویٹ یونین کے یوروپی حصہ سے ایک ایک منزلہ راکٹ چھوڑا جو ۴۷۳ کیلومیٹر کی عدیم النظیر بلندی تک پہنچا اور اس کا وہ خانہ جس میں مختلف قسم کے آلات کے ساتھ ایک کتا "مودنتیزا" بھی تھا ۲۱۲ کیلومیٹر کی بلندی سے کامیابی کے ساتھ اسی جگہ واپس آیا جہاں اس کا اُترنا مقرر کیا گیا تھا۔ اس طور پر مصنوعی سیاروں کی واپسی کے معاملے میں بھی اولیت کا سہرا روس ہی کے سر رہا۔

کس طرح وہ محفوظ رہے گا؟ خلار کے طبیعاتی مظاہر کا اُس کے جسم و جان پر کیا اثر مترتب ہوگا؟ سائنسدانوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ راکٹ میں انسان کے پرواز کرنے سے متعلق کوئی قطعی فیصلہ کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان تمام غیر معمولی عناصر کا اچھی طرح جائزہ لے لیا جائے جو خلار میں انسان کے نظام جسمانی پر اثر انداز ہوں گے مثلاً ضرورت سے زیادہ تکان، ناسیاتی صفر کشش، کائناتی شعاع ریزی اور سورج کی تابکاری۔ سب سے اہم، ایک انسان کو، بہت ہی کم مقیاس الہوائی دباؤ اور فضا کی اوپری تہوں میں آکسیجن کی کمی کے خلاف بچانے کا، مسئلہ ہے۔ اُنیس ۱۹ ، بیس ۲۰ کیلو میٹر کی بلندی پر انسان کو ایک شدید خطرے سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور وہ یہ کہ انسان کا خون ابلنے لگتا ہے (یعنی شریانوں کا بے رنگ عرق) اور نظام جسمانی کے دوسرے عروق کھولنے لگتے ہیں (معمولی حالات میں انسانی جسم کا درجہ حرارت عام طور سے چھتیس ۳۶، سینتیس ۳۷ سینٹی گریڈ ہوتا ہے) بلندی جتنی زیادہ ہوتی جاتی ہے ہوا میں آکسیجن کا دباؤ اتنا ہی کم ہوتا جاتا ہے) اس لئے ڈھائی تین کیلو میٹر کی بلندی پر بھی پرواز کرنے کے لئے تنفس کے واسطے خالص آکسیجن کا استعمال ضروری ہو جاتا ہے۔ بیس ۲۰ سے چوبیس ۲۴ کیلو میٹر تک کی بلندی تک جانے والے جہاز بھی، عام طور سے ہوا گذار کیبنوں سے لیس ہوتے ہیں، جن میں فضا سے ہوا پمپ کر کے ضروری دباؤ برقرار رکھا جاتا ہے اور اس سے زیادہ بلندی پر ہوا کا ثقل تو اتنا کم رہ جاتا ہے کہ ضروری دباؤ برقرار رکھنے کے لئے غیر معمولی طاقتور کمپریسر درکار ہوں گے۔ مختصر پروازوں میں تو انسان کو ڈبوں سے آکسیجن دی جا سکتی ہے لیکن طویل پروازوں میں ہوا کی عادی ترکیب کو برقرار رکھنے کے لئے ایسے کیمیاجات استعمال کرنے ہوں گے جو کاربن ڈائی آکسائڈ اور رطوبت کو جذب کر سکیں۔ یا ایسے پودوں اور

خورد بینی اجسام کو استعمال کیا جائے، جو فاضل کاربن اکسائڈ کو جذب کرلیں اور آکسیجن کی ضروری مقدار پیدا کر دیں، جیسے کہ ہمارے کرۂ ارض کے جنگل کرتے ہیں۔ دراصل کائناتی پرواز انسانی زندگی کے لئے خطرناک ہے۔ بار بار جانوروں کو تجربہ کے لئے اسی لئے بھیجا جارہا ہے کہ جو مضر اثرات ہوں گے اُن سے بچنے کی احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں۔ تجربہ سے پتہ چلا ہے کہ اگر زمین سے راکٹ کے بلند ہونے کے وقت انسان عمومی حالت میں رہے تو وہ تکان کے طول البلدی سرتاپا اثر کا شکار ہوگا۔ یہ اثر کچھ اس قسم کا ہوگا جیسے کہ کسی لفٹ میں بڑی تیزی کے ساتھ نیچے سے اُوپر جانے میں ہوتا ہے۔ اگر یہ تکان کشش کی عام طاقت سے چار یا پانچ گُنا زیادہ ہوگئی جس کا تجربہ زمین پر ہے اور چوبیس پچیس سکنڈ تک رہتی ہے تو اس کی وجہ سے انسانی نظام جسم میں بہت سی غیر معمولی تبدیلیاں ہوسکتی ہیں۔ مثلاً انسان کی ساری حرکات وسکنات غیر صحیح ہوجائیں گی، اعصابی نظام کے فعل میں تبدیلی آجائے گی۔ دماغ میں دورانِ خون کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ آنکھ کے پردوں کو ناکافی خون ملنے کی وجہ سے ممکن ہے کہ انسان کی بینائی میں فرق آجائے۔ دھندلا دھندلا دکھائی دے یا آنکھوں کے سامنے سُرخی یا سیاہ کہرسا چھا جائے بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ انسان بالکل ہی نابینا ہوجائے اور اس کا بھی امکان ہے کہ مسلسل تکان کی وجہ سے انسان پر نیم یا بالکل بیہوشی طاری ہوجائے۔ زمین سے جسم کے بلند ہونے کے ساتھ ساتھ کشش کا زور اور جسم کا وزن بھی گھٹتا جاتا ہے یہاں تک کہ زمین سے ایک لاکھ کلومیٹر کی بلندی پر انسانی جسم تقریباً بے وزن ہوجاتا ہے، عدم کشش کے اثرات کی ابتدائی منزل میں، ممکن ہے کہ انسان خلائی سمت کے تعین اور حرکات کے ربط وضبط

کی گردش کا بھی شکار ہو جائے، ممکن ہے کہ انسان اپنی خلائی مساعی کو سمجھنے میں کوئی غلطی کرے اور اُس کے دست و پا کے افعال بھی غیر صحیح اور چلنے ٹھکے ہو جائیں۔ اُوپری خلا میں انسان کی پرواز کے حیاتیاتی مسائل گوناگوں اور پیچ در پیچ ہیں، لہذا محض گولہ چاند تک پہنچا دینا کوئی چیز نہیں بلکہ اوپری خلاء میں انسانی پرواز کو یقینی اور غیر محفوظ بنانے کی طرف سے اطمینان حاصل کر لینا ضروری ہے۔

"خلاء" کے بعد پھر خود "چاند" کا مسئلہ اہم ہے جس پر اُترنا ہے۔ زمین سے چاند پر محض پہنچ جانا تو کوئی بات نہیں۔ ۳۰ گھنٹے میں انسان بہ اطمینان چاند تک پہنچ سکتا ہے مگر چاند کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ اُس کی پوری سطح پر روشنی یکساں نہیں ہے۔ اُس پر جو چھوٹے بڑے تاریک دھبے نظر آتے ہیں وہ دراصل بڑے بڑے نشیب اور غار ہیں، بعض سائنسدانوں کا خیال ہے کہ ممکن ہے بعض غاروں سے گیس نکلتی ہوں، ان کا مطالعہ اولیں ضروری ہے تاکہ انسان اُن غاروں میں نہ پہنچیں۔ صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ چاند پر کوئی فضا نہیں ہے اس لئے ٹوٹے ہوئے ستارے وغیرہ جو اُسکی سطح پر پہنچتے ہیں وہ اُس سے بڑے زور سے ٹکراتے ہیں۔ اس تصادم سے بچنے کی بھی صورت نکالنی ہے، چاند کی دنیا میں سکوتِ کامل ہے، وہاں وہ آواز پیدا ہی نہیں ہو سکتی جو فضائے ارضی میں پیدا ہوتی ہے، اس لئے چاند پر پہنچنے والوں کو ایسے خود پہننے ہوں گے جن میں چھوٹے چھوٹے ریڈیو ٹرانسمیٹر اور ریسیور لگے ہوں تاکہ جو لوگ وہاں پہنچیں وہ ایک دوسرے سے بات چیت کر سکیں۔ چاند پر کے بہت ہی کم دباؤ کے اثرات سے بچنے کے لئے انسان کو خاص قسم کا ہوا بند کپڑا پہننا ہوگا۔ سانس لینے کے لئے کافی

آکسیجن درکار ہوگی اِس بات کا بھی لحاظ کرنا ہوگا کہ انسان کا متوالبستہ کپڑا حرارت کو منضبط کرنے والے آلات سے لیس ہو تاکہ کائناتی مسافر کو چاند کی سطح پر ضروری درجۂ حرارت حاصل رہے، چاند پر صبح شام بھی نہیں ہوتی بلکہ دن سے رات اور رات سے دن ہونے کی تبدیلی اچانک ہوتی ہے، جب کوئی انسان چاند پر کسی پہاڑ کے سائے میں ہوگا تو پھر وہ اُس انسان کو مطلق نظر نہ آئے گا جو اُس کے پاس سائے سے باہر کھڑا ہوگا۔ چاند پر سورج کی روشنی بھی خیرہ کُن ہوگی۔ اُس کی چکا چوند پیدا کرنے والی چمک کو مدھم کرنے کا کوئی قدرتی سامان وہاں موجود نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اِن حالات کا مقابلہ کرنے کی تیاری ضروری ہے۔ غرض اِس طرح کی بہت سی چیزیں ہیں جن کو جانے بغیر چاند پر مصنوعی سیارہ یا اُس کے ذریعہ انسان کو پہنچا دینا کوئی قابلِ داد بات نہیں اور تینوں امریکی مصنوعی سیارے اس قدر مختصر ہیں کہ وہ ان میں سے ایک چیز کی بھی اطلاع نہیں دے سکتے اور نہیں دیتے۔ برخلاف اس کے دونوں عظیم روسی اسپوٹنکوں نے بہت سی اطلاعیں دی ہیں جن کے نتائج کو روسی سائنسدانوں نے کتابی شکل میں روسی، انگریزی اور اُردو زبانوں میں شائع کر دیا ہے۔ نہ صرف اتنا بلکہ روسی سائنسدانوں نے ۱۵ مئی ۱۹۵۸ء کو اپنا تیسرا عظیم الشان مہیب اسپوٹنک بھی چھوڑا جس کا مدار خطِ استوا کے دو سطح سے ۶۵ ڈگری کے زاویے پر ہے اور جو سطح زمین سے ۱۸۸۰ کیلومیٹر (۱۱۶۸ میل) کی بلندی پر زمین کے گرد چکر کاٹ رہا ہے اور پورا چکر ۱۰۶ منٹ میں ختم کر رہا ہے، اس تیسرے اور چوتھے سوویٹ اسپوٹنک کو بجا طور پر ایک عظیم کائناتی سائنسی کارخانہ یا ایک مہتم بالشان خودکار آسمانی تجربہ گاہ کہا جا سکتا ہے جس کا مقصود نوعِ انسانی کی بہبود کی خاطر، قدرت کی

صناعیوں کی چھان بین کرتا ہے کیوں کہ اس میں ہزاروں قسم کے پیچیدہ آلات اور ٹرانسمیٹر وغیرہ فٹ ہیں۔ تیسرے عظیم روسی اسپوٹنک کی کامیاب پرواز کے بعد ممتاز فرانسیسی سائنسداں اور عالمی امن کونسل کے صدر پروفیسر جولیو کیوری نے ایک بیان میں کہا تھا کہ:-

"تیسرے اسپوٹنک نے جو سابقہ مصنوعی چاندوں سے کہیں زیادہ بڑا ہے، ایک بار اور یہ دکھا دیا ہے کہ اگر سائنس کا استعمال پُر امن مقاصد کے لئے کیا جائے، تباہی کے لئے نہیں بلکہ تعمیر کے لئے کیا جائے تو کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تیسرے اسپوٹنک سے اوپری خلار کے مطالعے میں ایک نیا اور بڑا قدم اٹھانے میں بڑی مدد ملے گی۔"

اس کے جواب میں ایک روسی سائنسداں "دوبرابراووف" نے بیان دیا کہ:-

"ہاں! ۱۹۴۵ء میں ایک امریکی ایٹم بم کی گرج نے ساری دنیا کو ہلا دیا تھا۔ جس وقت یہ ٹکنیکی کارنامہ ظہور میں آیا، اسے ہزاروں بے گناہ انسانوں کی موت کا وقت بنا دیا۔ اس ہولناک واقعے کے ۱۲ سال بعد بنی نوع انسان کو ایک اور ٹکنیکی کارنامے کی خبر ملی۔ اپنی قسم کے اوّلین سوویٹ اسپوٹنکوں نے امن کے ہراول بنکر زمین کے گرد، پرواز وار گردش کی اور اب اس سلسلے کا تیسرا مصنوعی چاند، ذہانت انسانی کی علامت کی حیثیت سے، کائناتی خلار میں سرگرم پرواز ہے۔ یہ ایجاد اتنی عظیم الشان ہے کہ تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ بلند خیال سے بلند خیال لوگوں کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ آسمانوں کی تسخیر

کا دَور اتنی جلد شروع ہو جائے گا۔

"میرا خیال ہے کہ چاند پر انسان کے پہنچنے کے دس، پندرہ سال بعد، ہم وہاں ایک ایسا سائنسی مستقر بنا سکیں گے جو آلات و ماہرین سے پوری طرح لیس ہوگا اور پھر چالیس سال کی مدّت میں زمین اور چاند کے درمیان مسافروں کی آمد و رفت کا باقاعدہ بندوبست ہو جائے گا۔ تمام آثار اس بات کے ہیں کہ اس صدی کے ختم ہوتے ہوتے انسان کرۂ ارض سے بعید ترین سیاروں پر راکٹ بھیجنے لگے گا۔"

بہرکیف! اس وقت زمین یا سورج کے گرد چکّر لگانے والے مصنوعی چاندوں کے سلسلے میں امریکی و روسی کامیاب کارنامے کی صورت یوں ہے۔

سوویٹ مصنوعی چاند

اسپوٹنک	نمبر ١	٤ر اکتوبر ١٩٥٧ء	کو چھوڑا گیا	جس کا وزن ہے	٨٣٫٦	کیلوگرام
"	نمبر ٢	٣ر نومبر "	"	"	٥٠٨٫٣	"
"	نمبر ٣	١٥ر مئی ١٩٥٨ء	"	"	١٣٢٧	"
"	نمبر ٤	٢ر جنوری ١٩٥٩ء	"	"	٣٦١٫٣	"

(امریکی مصنوعی چاند)

پہلا	تابع سیارہ	٣١ر جنوری ١٩٥٨ء	کو چھوڑا گیا	جس کا وزن ہے	تقریباً ١٤	کیلوگرام
دوسرا	"	" ١٧ر مارچ ١٩٥٨ء	"	"	١٫٥	"
تیسرا	"	" ٢٦ر مارچ ١٩٥٨ء	"	"	تقریباً ١٤	"
چوتھا	" لہ	" ٣ر مارچ ١٩٥٩ء	"	"	تقریباً ٦٫٧٥	"

راکٹ (ROCKET) کوئی عجوبہ چیز نہیں، دراصل اس کا تصور آتشبازی

لہ سورج کے تابع دوسرا مصنوعی سیارہ

کے "آسمان تارہ" سے لیا گیا ہے جو بہت قدیم ہے مگر اب اس کی کامیاب پرواز نے تعلقات ارض و سماء کی داغ بیل ڈال دی ہے اور اس کا سہرا سوویٹ روس کے سر ہے۔ اس کامیابی کو روس دشمن عناصر نے جرمن سائنسدانوں کا کارنامہ ظاہر کرنا شروع کیا تو روسی سائنسدانوں نے ۱۷ نومبر ۱۹۵۷ء کو اس کے جواب میں جو کچھ ماسکو سے اعلان کیا وہ عبرت انگیز ہے انھوں نے کہا کہ :-

"انھیں مصنوعی سیاروں کے چھوڑنے کے اصولوں کا علم سب سے پہلے ایک آٹھ سو سال پرانی عربی کتاب سے حاصل ہوا۔ مطالعہ کے بعد سے اُسے عملی شکل دینے کے لئے تجزیے شروع کئے گئے اور رفتہ رفتہ اس میدان میں کامیابی ہوئی"۔

بہر کیف! روس اور امریکہ کے مصنوعی سیاروں کی کامیاب پرواز دگردش نے اب کائناتی سفر کو ممکن بنا دیا ہے اور ان کے آئندہ کے پروگراموں کے اعلانات سے مسلمان تک مشوش ہیں کہ کیا واقعی ایسا ہوگا ؟ کیا حقیقتاً انسان کرۂ ارض سے باہر نکل سکتا ہے اور دوسرے آسمانوں میں جا سکتا ہے ؟ مسلمانوں کو یہ تردد غالباً قرآن ہی کی دو آیتوں کو قرار واقعی نہ سمجھنے سے پیدا ہوا ہے۔ قرآن میں، حق فراموشیوں کا ذکر کرتے ہوئے دو جگہ ارشاد ہوا ہے کہ :-

(۱) قَالُوا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا ... ... اَوْ تَرْقٰى فِى السَّمَآءِ ۚ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى	"لوگ کہتے ہیں کہ ہم تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ تم ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ نہ جاری کردو ... ... یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہم تمہارے آسمان پر بھی چڑھ جانے کا یقین نہ کریں گے۔ جب تک کہ تم ہمارے پاس

تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ ط قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا ۝	ایسی تحریر نہ لاؤ جس کو ہم پڑھ سکیں۔ تم اُن کہدو کہ سُبحان اللہ! میں بجز اس کے کہ پیغام پہنچانے والا آدمی ہوں اور کیا
(بنی اسرائیل ۱۰- ۹۰- ۹۳)	ہوں؟'
(۲) لَا يُؤْمِنُونَ بِهٖ ... وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ لَقَالُوا إِنَّمَا سُكِّرَتْ أَبْصَارُنَا	"یہ لوگ خدا پر ایمان نہیں لائیں گے ... اور اگر ہم اُن لوگوں کے لئے آسمان میں کوئی دروازہ کھول دیں، پھر یہ روشنی میں اُس میں چڑھ جائیں تب بھی کہدیں گے کہ ہماری نظر مخمور ہو گئی ہے۔"
(الحجر ۱- ۱۴- ۱۵)	

اِن دونوں آیتوں کی کسی آیت میں بھی آسمان میں جانے یا قرآنی الفاظ میں فی نفسہٖ افلاک پر چڑھنے کی تردید نہیں کہ کسی طرح بھی کوئی آسمانوں میں جا ہی نہیں سکتا۔ بلکہ صرف رسول اللہ کے آسمان پر چڑھنے کی نفی کی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے کہ کہدو میں ایسا نہیں کر سکتا اس لئے کہ میرا یہ منصب ہی نہیں ہے کہ میں تمہاری فرمائشیں پوری کیا کروں یا تمہارے اعتراضات کے جواب میں وہ کچھ کردوں، جس کی تم خواہش رکھتے ہو۔ تم تو یہ بھی کہہ دو گے کہ آسمان پر چڑھ جاؤ۔ تو کیا میں تمہاری خواہش پر یا تمہاری خوشنودی کیلئے ایسا کروں گا؟ میں ایک پیغام رساں انسان ہوں۔ میرا کام رہنمائی ہے تمہارا دل قبول کرے تو میری بات مانو کہ تمہارا ہی بھلا ہوگا، ورنہ اپنی روش پر قائم رہو۔ میں تمہارے بھلے بُرے کا ذمہ دار تھوڑا ہی ہوں؟

اِن آیتوں سے اِس امر کی تردید نہیں ہوتی کہ انسان کرۂ ارض سے باہر نکل ہی نہیں سکتا یا آسمانوں میں جا ہی نہیں سکتا۔ بلکہ دوسری آیت میں

تو ایسا ممکن ہونے کا واضح بیان موجود ہے۔ یعنی اگر ہم ایسا کر دیں کہ آسمانوں کے دروازے کھول دیں اور یہ چڑھ بھی جائیں تو بھی اِن کی انکاری روش یہ ہے کہ اُس کو بھی جادو کہدیں گے اور نہ مانیں گے۔ دراصل اِن آیتوں میں منکرین کی انکاری روش کا اظہار اور اُن کی ہٹ دھرمی اور بات کی پیچ رکھنے کی فطرت کا ذکر ہے۔ آسمانوں میں کسی انسان کے چڑھنے کی تردید نہیں۔ آسمانوں یا سیاروں کی تسخیر کے صاف بیانات موجود ہیں۔ پھر جب انسان ان میں جا ہی نہیں سکتے تو وہ انسانوں کے لئے مسخر کیا کئے گئے ہیں؟ قرآن نے اِس مسئلہ میں بہت واضح طور پر رہنمائی کی ہے کہ آسمانوں میں جانا مادّی طاقت پر منحصر ہے۔ مادّی طاقت کے بغیر انسان نہ تو کرۂ ارض سے ہی باہر نکل سکتا ہے اور نہ دوسرے آسمانوں میں جا سکتا ہے۔ جب بھی ایسی مادّی طاقت وجود میں آجائے گی یہ بات بالکل ممکن ہو گی اور ایسا وقت آئے گا کہ یہ ہو کے رہے گا۔ انسانوں اور جنّوں کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے:-

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۔ (رحمٰن ۲-۵۵/۳۳)

"اے گروہ جِنّ و اِنس! اگر تم سکت رکھتے ہو کہ آسمانوں اور زمین کے اقطار سے باہر نکل جاؤ تو نکلو تو؟ تم ہرگز نہیں نکل سکتے، مگر ہاں سُلطان (طاقت، غلبہ، زور) کے ذریعے۔"

اِس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ جن ہوں یا انسان، کوئی شخص بھی (بِلا اِستثناء) یوں نہ تو کرۂ ارض سے باہر نکل سکتا ہے اور نہ آسمانوں میں داخل ہو سکتا ہے مگر اِس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ صورت

ہے "سلطٰن" یعنی طاقت، توانائی، غلبہ، زور۔ یہ طاقت بہم ہو جانے پر انسان بلاشبہ کرۂ ارض سے نکل بھی سکتا ہے اور آسمانوں میں جا بھی سکتا ہے۔ البتہ بغیر "طاقت" کے یہ ممکن نہیں ہے۔ لفظ "سلطٰن" خود قرآن نے بمعنی طاقت، توانائی اور زور کے، اسی سورۂ الحجر میں بسلسلۂ شیطٰن، استعمال کیا ہے:—

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ (۱۵/۴۲) "جو میرے بندے ہیں اُن پر تیرا زور نہ چلے گا۔"

رومی نے "جاوید نامہ" میں اقبال کو اسی "سلطٰن" کی طرف توجہ کرنے کا مشورہ دیا تھا:—

گفت اگر "سلطٰن" ترا آید بدست　　می تواں افلاک را از ہم شکست

نکتۂ "اِلّا بسلطٰن" یاد گیر　　ورنہ چوں مور و ملخ در گل بمیر

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ کرۂ ارض سے نکلنا یا آسمانوں میں جانا از روئے قرآن ممکن نہیں ہے اور ثبوت میں سورۂ رحمٰن والی مندرجۂ بالا آیت ہی کو پیش کر کے فرماتے ہیں کہ یہ انسانوں اور جنّوں کو ایک خدائی چیلنج ہے۔ اور اس آیت میں زمین و آسمان کے اقطاروں سے نکلنے کی قطعی نفی کی گئی ہے۔ مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اس آیت میں نہ تو جنّ و انس کو چیلنج ہی ہے اور نہ اس آیت میں ایسا ممکن ہونے کی نفی ہی کی گئی ہے۔ اسے نفی اور چیلنج جب ہی کہا جا سکتا تھا جب اس میں "اِلّا بِسُلطٰن" کا استثنائی ٹکڑا موجود نہ ہوتا۔ مگر جب خود اللہ تعالیٰ "سلطٰن" کے ذریعہ ایسا ہونا بالکل ممکن ظاہر فرما رہا ہے تو اسے چیلنج کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے جب واقعی کسی معاملے میں جنّوں اور انسانوں کو چیلنج کیا ہے تو وہاں

"اِلّا" کی شرط نہیں لگائی ہے بلکہ غیر مشروط چیلنج کیا ہے۔ مثلاً قرآن کا مثل بنالانا کبھی کسی جن و انس سے ممکن نہیں ہے۔ اِس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں کو چیلنج کیا ہے کہ اے پیغمبر!

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ
وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ
هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ
بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ
لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝
(بنی اسرائیل ۱۰۔ ۱۷/۸۸)

"اعلان کر دو کہ اگر سارے اِنس و جن بھی مجتمع اور اکٹھا ہو کر کوشش کریں کہ اس قرآن کا مثل بنا لائیں تو وہ اس جیسا قرآن ہرگز نہیں لاسکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے کتنے ہی مددگار کیوں نہ بنیں۔"

اِس مقام کے علاوہ بھی، قرآن جیسا لانے کے سلسلے میں چیلنج، قرآن میں موجود ہے (مثلاً ۲/۲۳-۲۴، ۱۰/۳۸، ۱۱/۱۳-۱۴، ۵۲/۳۳-۳۴) مگر انہیں بھی "اِلّا" کی شرط نہیں لگائی گئی ہے۔ در اصل سورۂ رحمٰن والی آیت میں نفی نہیں ہے بلکہ وہ ایک مشروط بیان ہے اور اس طرح کے انداز بیان والی آیتیں قرآن میں بہت ملیں گی جن سے ابتداً نفی ظاہر ہوتی ہے مگر حقیقتاً ان میں نفی نہیں کی گئی ہوتی ہو بلکہ مشروط بیان کیا گیا ہوتا ہے۔ مثلاً :-

(۱) وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝
(انعام ۷۔ ۶/۵۹)

"اور نہ کوئی چیز ہری ہے اور نہ کوئی سوکھی، مگر یہ کہ وہ اِس واضح کتاب میں موجود ہے۔"

(۲) اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (نجم ۳۔ ۵۳/۳۹)

"بیشک انسان کو کچھ نہیں ملے گا مگر ہاں جتنا بھر کر وہ محنت کرے گا۔"

(۳) وَالْعَصْرِ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۝ — زمانہ کی قسم کہ انسان نقصان میں ہے۔ بجز ان لوگوں کے
اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ — جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک
(العصر۔ ۳-۱۰۳) — اعمال صالح کیے۔"

فی زمانہ یہ طاقت و توانائی اور غلبہ و زور (سلطان) کی تلاش میں انسان مصروف ہے اور بہت کچھ تلاش کر کے پا چکا بھی ہے۔ بہرکیف! امریکہ اور روس کے سائنسدان "اٹیمک انرجی" کی دریافت کے بعد البتہ سوچنے لگے کہ کرۂ ارض سے باہر نکلنا اور آسمانوں میں جانا بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ اس سے بہت پہلے خواجہ احمدالدین امرتسری نے اپنی تفسیر "بیانُ لِلنّاس" کی جلد اوّل صفحہ ۱۴ میں جو ۱۹۳۵ء میں شائع ہو چکی تھی، بسلسلہ تفسیر سورۂ فاتحہ تحریر فرمایا تھا کہ:-

"یہ زمین بحیثیت مجموعی ایک "عالم" ہے۔ اس کائنات میں اس قسم کے بے شمار عالم ہیں۔ عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری، زحل وغیرہ بھی عالمین کے لفظ میں داخل ہیں[1]۔ عالمین کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری زمین کے علاوہ اس کائنات میں اور بھی آباد دُنیائیں ہیں جن میں "دوآب" (چلنے پھرنے والے جانور) پائے جاتے ہیں "دابہ" میں حشرات الارض، انسان اور چارپائے وغیرہ سب شامل ہیں جو حقیر پانی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَثَّ فِیْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ وَ هُوَ عَلٰی جَمْعِهِمْ اِذَا یَشَآءُ قَدِیْرٌ۝ (شوریٰ ۲۔ ۴۲/۲۹) یعنی آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور جو آسمانوں اور زمین ہر دو میں خدا نے جاندار پھیلائے ہیں یہ اس کی نشانیوں میں سے ہے اور جب وہ چاہے، اُن کو جمع کرنے اور ملانے پر قادر ہے۔

---

[1] گمان مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمن ماست — کہ ہر ستارہ جہان است یا جہاں بودست (اقبال)

اِس آیۂ مبارک سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری اِس زمین کے علاوہ اور آسمانوں میں بھی ویسے ہی "جاندار" پائے جاتے ہیں۔ پس اِس زمین کے علاوہ دیگر عالم یا جہان بھی بالضرور موجود ہیں۔ الحمد شریف میں عالمین کے لفظ کو جمع لانے سے اِس بات کا ثبوت ملتا ہے۔

مذکورہ بالا آیت سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ...

خدا تعالیٰ جب چاہے زمین اور مریخ وغیرہ کے لوگوں میں سلسلۂ پیغام رسانی قائم کر کے انھیں آپس میں ملا دے۔"

فاضل مفسر نے جو آیت پیش کی ہے اُس سے قطعی ظاہر ہے کہ زمین کی طرح آسمانوں یعنی دوسرے سیّاروں میں بھی آبادی ہے۔ اور اِن دونوں آبادیوں کا کبھی باہم جمع اور اکٹھا ہونا مقدّر ہو چکا ہے۔ البتہ جب چاہے (اذا یشاء) سے زمانہ کا تعیّن نہیں کیا جا سکتا۔ اِس لئے کہ زمین کی کشش سے باہر نکل جانے اور دوسرے آسمانوں میں حسبِ خواہش جانے اور آنے کیلئے جس مضبوط اٹیمک طاقت اور پائیدار توانائی (سلطان) کی ضرورت ہے اس کے کامیاب طور پر بہم پہنچانے ہی پر اس کا انحصار ہے۔

سورۂ مومنون کی آیت جو میں نے شروع میں پیش کی ہے۔ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ (۱۷/۲۳) اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ زمین، اور آسمانوں میں رابطہ قائم ہونا ضروری ہے۔ "طرائق" جمع ہے جس کی واحد "طریق" ہے۔ "طریق" کے معنی "راستہ" کے ہیں۔ اور "راستہ" کی تعریف یہ ہو کہ اُسکے دونوں سرے کھلے ہوں تاکہ آدمی اُس سے گذر جائے اسی لئے میں نے "طرائق" کا ترجمہ "گذرگاہیں" کیا ہے۔ کیونکہ "طرائق" کے لفظ سے ظاہر ہے کہ "سبع سمٰوٰت" میں انسانوں کا داخلہ یعنی ایک سے نکل کر دوسرے میں جانا بالکل ممکن ہے۔ "گذرگاہ" کون اور کس طرح ہو سکتی ہے جسمیں نہ کوئی

داخل ہی ہو سکے اور نہ اُس میں سے نکل ہی سکے؟ سورہ ذٰریٰت میں ہے:-

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ "آسمان کی قسم جس میں کہ راستے ہیں" (ذٰریٰت ۱ء ۵۱)

اِس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سبع سمٰوٰت میں آنا جانا قطعی ممکن ہے پروفیسر جوڈ جیسا کہ آپ گذشتہ اوراق میں پڑھ چکے ہیں، یہ تو نہیں مانتا کہ اِسوقت زمین کی سی آبادی، مریخ اور زہرہ کے علاوہ نظامِ شمسی کے دوسرے سیاروں میں بھی موجود ہے، مگر وہ نسلِ انسانی کا مستقبل کیا ہے؟ کے جواب میں لکھتا ہے کہ:-

"ہم اچھے خاصے تیقن سے یہ بات جانتے ہیں کہ بوڑھے زمین پر زندگی کا کیا حشر ہوگا؟ یہ زمین جس طرح کبھی اتنا گرم تھی کہ یہاں زندگی نہ رہ سکتی تھی، اُسی طرح جب سورج کی حرارت ختم ہونی شروع ہو جائے گی تو زمین اتنی سرد اور خشک ہو جائے گی کہ اِس صورت میں زندگی کا باقی رہنا ممکن نہ رہے گا۔ ... لیکن اِس قسم کی صورتِ حال کے پیدا ہونے سے بہت پہلے انسان اپنے آپ کو کسی دوسرے سیارے میں منتقل کرنے کا طریقہ سیکھ چکا ہوگا۔ جب زمین ٹھنڈی ہونے لگے گی تو انسان زبردست انتقال آبادی کر کے ایسے سیارے میں جا کر آباد ہو جائے گا، جو سورج کے قریب ہو، مثلاً زہرہ یا عطارد، اور جب سورج کی حرارت ختم ہونی شروع ہو گی تو انسان نظامِ شمسی سے باہر کے کسی ایسے سیارے میں جا سکتا ہے جو کہکشاں کے کسی کم عمر لیکن زیادہ گرم تارے کے گرد چکر لگا رہا ہو۔ انسان کی بے حد قوتِ ایجاد کو دیکھتے ہوئے ہمیں یہ تسلیم کرنا

"پڑتا ہو کہ مستقبل میں اس قسم کے ارتقائی مراحل طے ہونا بعید از قیاس نہیں۔"
"یعنی ہم جو یہ تسلیم کرتا ہو کہ انسان نہ صرف دوسرے سیاروں میں کبھی بآسانی جا سکے گا بلکہ وہ یہاں تک مانتا ہے کہ انسان اپنے نظامِ شمسی سے بھی نکل کر دوسرے نظام میں بھی جا سکے گا۔"

آخر میں پھر ایک بار اس مسئلہ کو ذہن نشین فرما لیجئے۔ آپ قرآن شروع کرتے ہیں اس آیت سے:-

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ سب تعریف اللہ کے لئے جو ساری دنیاؤں کا رب ہے۔[1]

اور صورت یہ ہو کہ "ربوبیت" کا تعلق "زندگی" سے ہے۔ جہاں "زندگی" نہیں وہاں زندگی کی بقا اور نشو و نما کے لئے سامانِ حیات کی بہم رسانی (ربوبیت) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر اگر زمین کے علاوہ آسمانوں میں "زندگی" نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ کا "ربّ العلمین" ہونا ثابت نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہ قطعی ہے کہ "آسمانوں" میں بھی ویسی ہی آبادیاں ہیں جیسی زمین میں۔ وہاں بھی اسی طرح "زندگی" اور "حیات" کارفرما ہے جس طرح زمین میں۔ اب ملاحظہ فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ "ربّ العلمین" اس کا رسول "خاتم النبیین" اور "رحمۃ للعلمین" اور خدا کا آخری محفوظ پیغام قرآن کی شکل میں "ذکر للعلمین" اور زمین محض "ایک عالم" ہے "عالمین" ہرگز نہیں۔ لہٰذا "آسمانوں" کا "عالمین" میں داخل و شامل ہونا قطعی ہے اور پھر وہاں "آبادیوں" کا ہونا بھی لازمی۔ پھر اگر وہاں کی رسالت اور پیغام رسانی "نبی آخر حضرت محمد رسول اللہ صلعم" ہی کے ذمہ نہیں ہوتی تو وہ نہ "رحمۃ للعلمین" ہی ہو سکتے اور کہلا سکتے تھے اور نہ ہی "خاتم النبیین" کیونکہ اس صورت میں

[1] "ربّ العلمین" میں "عالمین" سے کیا مراد ہے؟ اس کی تشریح یہاں ہے۔
فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ (جاثیہ ۴۵ - ۳۶)
"آسمانوں اور ان کی ربوبیت کرنے والا اللہ اور زمین اور ان کی ربوبیت کرنے والا یعنی ساری دنیاؤں والے جاندار کی ربوبیت کرنے والا۔"

وہاں کی آبادیوں کے لئے دوسرا رسول مبعوث ہونا چاہیئے پھر اگر یعنی انسانوں ہی کے تو تعیہ "خاتم النبیین" و "رحمۃ العالمین" ہی کو فرض نبوت و رسالت ان آباد ساتوں آسمانوں میں بھی ادا کرنا تھا تو اس کے لئے آنحضرت کو سند خصوصی اور وسیع اختیار ملنا بھی قطعی ضروری تھا ورنہ بغیر اس کے قرآن کا آسمانوں والی آبادیوں تک پہنچانا کسی طرح بھی درست نہ ہوتا اس لئے :۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ ( ) ——
خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ( ) اور رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ( ) سے فرمایا کہ
اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ( ) ——

لے اے میرا محبوب! میرا آخری پیغامبر!! میں تجھے "قرآن عظیم" پہنچانے کے لئے زمین تو الگ رہی کہ یہ نعمت اوروں کو بھی مل چکی تھی! میں نظام شمسی میں گردش کرنے والے لاتعداد سیاروں میں سے وہ ساتوں آسمان اور سیارے بھی تجھے دیتا ہوں جن میں آبادیاں ہیں۔

(۱) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ( ) — سب تعریف اللہ کیلئے جو ساری دنیاؤں والوں کی ربوبیت کرنے والا ہے۔

(۲) وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ( ) — اور ہم نے تمہیں اور کچھ بنا کے نہیں بھیجا ہے مگر ساری دنیاؤں والوں کے لئے رحمت بنا کر

(۳) اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِیْنٍ — یہ قرآن اور کیا ہے سوائے اس کے کہ نصیحت ہے ساری دنیاؤں والوں کے لئے اور تم کو اس کا حال تھوڑے دنوں بعد معلوم ہو جائے گا

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں — کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے (اقبال)

لے جہاں تمام ہے میراث مرد مومن کی — مرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک (اقبال)

آتش از نالۂ مرغانِ حرم گیر و بسوز
آشیانے کہ نہادی بہ نہالِ دگراں

در جہاں بال و پرِ خویش کشودن آموز
کہ پریدن نہ تواں با پر و بالِ دگراں

(اقبال)

(پیام مشرق۔ صفحہ ۳۰۹)

پیدائشِ عیسیٰؑ

داستانِ کُہنہ شستی باب باب
فکر را روشن کُن از "اُمّ الکتاب" (اقبال)

حضرتِ عیسیٰ مسیح ابنِ مریم علیہ السلام کی، بغیر باپ کی پیدائش کا مسئلہ اہلِ علم قرآن خوانوں کے درمیان بھی متنازعہ ہے۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ تخلیق انسانی کا دستور مرد و عورت کے باہم ملنے پر ہے اور اللہ تعالیٰ کا دعویٰ ہے کہ تم میرے دستور میں کبھی فرق نہ پاؤ گے لہذا حضرت عیسیٰ کا بغیر باپ کے پیدا ہونا قانونِ قدرت کے خلاف ہے اس لئے کہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے پس حضرتِ عیسیٰ بغیر باپ کے ہرگز پیدا نہیں ہوئے بلکہ حضرت مریم کا نکاح ایک شخص سے ہوا تھا جس کا نام یوسف تھا اور حضرت عیسیٰ اسی یوسف کے نطفہ سے تھے۔

میں نے قرآن میں جو کچھ فکر کیا ہے، اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مریم کا کوئی شوہر کبھی نہیں تھا۔ قرآن میں نہ تو یوسف کا نام یا ذکر یا اشارہ ہے اور نہ حضرت مریم کی شوہردارانہ زندگی کا کوئی بیان ہے۔ صرف اِتنا بلکہ میری فکر یہ بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ یقیناً بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے اور ایسا ہونا ہرگز قانون قدرت کے خلاف بھی نہیں تھا۔ اور یہ پیدائش، تمام بنی نوع انسان کے لئے ایک موضوعِ فکر و گفتگو اور ایک عنوانِ تلاش و جستجو بنائی گئی تھی۔ مگر

اس مسئلہ پر کبھی سنجیدگی کے ساتھ توجہ نہیں دی گئی۔ آئیے! اس عنوان پر ذرا تفصیل سے اور مختلف زاویوں سے گفتگو اور غور کرتا ہوں:۔

(۱)

قرآن میں بجز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اور کسی بھی پیغمبر یا انسان کی نسبت "ماں" سے نہیں کی گئی ہے اور حضرتِ عیسیٰ کو دو چار جگہ نہیں بلکہ بیسیوں مقامات پر "عیسیٰ بن مریم" کہا گیا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ بیسیوں جگہ تو حضرت عیسیٰ کی نسبت "ماں" کی طرف کی جائے اور انھیں بار بار "مریم کا بیٹا" کہا جائے مگر کسی ایک جگہ بھی اُن کی نسبت "باپ" سے نہ کی جائے اور انھیں یوسف کا بیٹا نہ کہا جائے جبکہ اُن کے باپ یوسف موجود تھے؛ لوگوں نے جب حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دیا تھا:۔

قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ (توبہ ۵۔ ۳۰) "نصاریٰ کہتے ہیں کہ عیسیٰ خدا کا بیٹا ہے"

تو جواب دیا گیا تھا کہ:

قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ ۔ ۔ ۔ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ (توبہ ۵۔ ۳۱) "اللہ اُن کو ہلاک کرے۔ ۔ ۔ مسیح تو مریم کا بیٹا ہے"

بھلا اس سے بہتر کون سا موقع ہو سکتا تھا کہ مسیح کو اُن کے باپ سے منسوب کر کے بتا دیا جائے کہ وہ یوسف یا فلاں کا بیٹا ہے؛ مگر یہاں بھی اُن کی نسبت ماں ہی سے کی گئی۔ حضرتِ عیسیٰ کی باپ سے نسبت کسی جگہ نہ ہونے کا قطعی مطلب یہ ہے کہ حضرتِ عیسیٰ کا کوئی "باپ" تھا ہی نہیں جس کی طرف اُن کو منسوب کیا جائے

بلاشبہ بہت سے پیغمبروں کا ذکر قرآن میں ہوا ہے اور اُن کے بھی باپ کا نام (بہ استثنائے چند) نہیں لیا گیا ہے، مگر انھیں یا کسی کو بھی اُن کی "ماں" سے

اُس طرح منسوب نہیں کیا گیا ہے جس طرح حضرت عیسیٰؑ کو کیا گیا ہے۔ قرآن میں بیان کردہ پیغمبروں میں حضرت عیسیٰؑ واحد پیغمبر ہیں جن کی نسبت بار بار ماں اور صرف ماں سے کی گئی ہے۔ لہٰذا حضرت عیسیٰؑ کے سلسلے کی خصوصیت بجز اس اظہار کے اور کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے

(۲)

قرآن کی تین آیتیں یوں ہیں:-

(۱) مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ انْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ انْظُرْ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ (مائدہ ۱۰- ۵/۷۵)

"مسیح ابن مریم سوائے رسول کے اور کچھ بھی نہیں اُس جیسے پیغمبر پہلے کتنے ہی گذر چکے ہیں اور اُس کی ماں نہایت سچی عورت تھی۔ دونوں کھانا بھی کھایا کرتے تھے۔ ذرا دیکھو تو کہ کیونکر ہم ان سے دلائل بیان کرتے ہیں، پھر یہ بھی دیکھو کہ لوگ اُلٹا کدھر جا رہے ہیں؟"

(۲) يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ إِذْ أَيَّدْتُكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ

(بقرہ ۱۱- ۲/۸۷ و ۳۳- ۲/۲۵۳ مائدہ ۱۵- ۵/۱۱۰)

"اے عیسیٰ ابن مریم! یاد کرو میرے اُس انعام کو جو ہم نے تم پر اور تمہاری ماں پر کیا جب کہ میں نے روح القدس سے تمہاری دستگیری کی؟"

(۳) لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُهْلِكَ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ وَمَنْ

"وہ لوگ یقیناً کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ عیسیٰ ابن مریم اللہ ہے۔ تم پوچھو تو کہ اگر ایسا ہے تو بتلاؤ کہ اگر مسیح ابن مریم اور اس کی ماں کو اللہ ہلاک کرنا چاہے تو کون ایسا ہے زمین والوں میں سے جو اُن کو بچا سکے؟

فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۗ وَلِلَّهِ مُلْكُ
السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ
يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۚ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيرٌ (المائدہ ۵: ۱۷)

آسمانوں اور زمین اور جو اُن کے درمیان ہیں سب پر اللہ ہی کی حکومت ہے اور وہ جس طرح چاہے پیدا کرے اور اللہ کو ہر چیز پر پوری قدرت حاصل ہے۔

اِن آیتوں میں کئی اہم باتیں قابلِ غور ہیں :-

اِن مقامات پر صرف حضرت عیسیٰ اور اُن کی "ماں" کا کیوں ذکر ہے جبکہ اُن کے "باپ" بھی تھے ہی؟ اور پھر جب اُن کے "باپ" تھے ہی اور "ماں" کا ذکر الگ کیا ہی جا رہا تھا تو اُن جگہوں پر بھی "عیسیٰ ابنِ مریم" کی تخصیص کے ساتھ، اُن کو موسوم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیوں نہ یوں کہا کہ مسیح ابنِ یوسف اور اُس کی ماں؟ باپ کے موجود ہوتے ہوئے یہ کیا اندازِ بیان اختیار کیا گیا کہ "عیسیٰ ابنِ مریم اور اُس کی ماں"؟ آخر باپ نے کون ایسا جرم کیا تھا کہ اُن کو مطلقاً نظر انداز کر دیا گیا؟

پہلی آیت میں ہے کہ "عیسیٰ اور اُس کی ماں کھانا بھی کھاتے تھے"۔ یہاں تثنیہ کا صیغہ کیوں استعمال کیا گیا جب کہ عیسیٰ کے "باپ" بھی موجود تھے؟ کیا عیسیٰ کے باپ "انسان" نہ تھے اور وہ کھانا نہ کھاتے تھے؟ نیز اِس آیت میں "مسیح ابنِ مریم" کہہ کے اور "اُمُّهٗ صِدِّيقَةٌ" کا سرٹیفکٹ دینے کے بعد یہ کیوں کہا گیا کہ ہم دلیلیں پیش کرتے ہیں مگر اِس کے باوجود لوگ اُلٹا سمجھ رہے ہیں؟

حضرتِ مریم "نبی" نہ تھیں کہ اُن کی سچائی کے اظہار میں مبالغہ کا صیغہ "صِدِّيقَةٌ" استعمال کیا گیا۔ ایسا تو "پیغمبر" ہی کے سلسلے میں ہوتا ہے۔ سورۂ مریم ہی میں حضرتِ ابراہیمؑ کے بارے میں آیا ہے کہ :-

اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیْقاً نَّبِیًّاہ "بے شک وہ نہایت ہی سچا نبی تھا۔" (مریم ۲-۱۹)

حضرتِ مریمؑ پر بہتان دھرا گیا تھا کہ وہ "حرامکاری" کی مرتکب ہوئی ہے۔ اب اگر حضرتِ مریمؑ، شوہردار ہی تھیں اور اُن کو شوہر سے قربت کے بعد ہی بچہ پیدا ہوا تھا تو اللہ تعالیٰ کو، اُن کی سچائی کے ذکر کی اور اُس کے لئے بھی مبالغہ کا صیغہ استعمال کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ تو جب ہی ہو سکتا ہے جب اُن سے متعلق "نبوّت" کے سوا کوئی دوسرا ہی معاملہ اِس قدر اہم ہو کہ اُن کی سچائی کی شہادت آسمانی دینی ضرور ہو؟ ظاہر ہے کہ یہ معاملہ سوائے اِس کے دوسرا نہیں کہ اُن کو واقعتاً بلا قربتِ مرد بچہ ہوا تھا اور اللہ تعالیٰ کو اس امر کی شہادت دینی پڑی کہ مریم اپنے قول :-

لَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَکُ بَغِیًّا "میں نہ تو شوہردار ہی ہوں اور نہ ہی حرام کار۔" (مریم ۲-۲۰)

میں قطعی سچی ہے اور اِس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ اُس کو عیسٰی کا سا ہرگز بیوہ بیٹا پیدا ہوا تھا۔ اور اِسی لئے اِس امر کی بھی تردید کی گئی کہ بغیر باپ کے عیسٰی کے پیدا ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ خدا کا بیٹا ہے۔ وہ بھی ایک رسول ہے بس۔ پھر بطور خاص دلیل پیش کرنے اور اِس کے باوجود لوگوں کی رُوگردانی کا بھی ذکر کیا گیا کہ لوگ خواہ مخواہ اُلٹی طرف جا رہے ہیں۔

دوسری آیت میں، جو قرآن میں تین تین جگہ ہے، حضرتِ عیسٰی کی پیدائش کے سلسلے میں اُن کی ماں پر اور خود اُن پر "رُوح القدس" سے امداد کا احسان دھرا گیا ہے۔ "رُوح القدس" سے متعلق تو میری رائے آگے ملے گی، یہاں سوال یہ ہے کہ اِس سلسلے میں تینوں جگہ صرف اُن کی "ماں" کا کیوں نام

لیا گیا جبکہ اُن کے "باپ" بھی تھے ہی؟ اور پھر جب حضرت عیسیٰ کے "باپ" تھے ہی تو حضرت عیسیٰ یا اُن کی ماں پر "رُوح القدس" کا کیا احسان ہوا جو اصرار کے ساتھ اُن پر دھرا گیا؟ اور اگر اُن پر واقعی محض "روح القدس" ہی کا احسان تھا تو پھر "یوسف" کی ضرورت کیا رہی؟ اور وہ ہوئے کیا؟ یہ کیا بات کہ ایک بچّے کی پیدائش کے سلسلے میں "رُوحُ القدس" کا تو بار بار بیان ہو اور احسان دھرا جائے مگر اس کے باپ کا کہیں بھی اور ایک بار بھی ذکر نہ ہو؟ ایک عورت کو بیٹا پیدا ہونے پر "رُوحُ القدس" کا تو متعدد بار ممنونِ کرم جتایا جائے مگر اس کے شوہر کا کوئی ذکر ہی نہ ہو؟

تیسری آیت میں حضرت عیسیٰ کو "خدا" کہنے کی تردید کی گئی ہے۔ آخر حضرت عیسیٰ کو لوگ "خدا" کہتے کیوں تھے؟ یا خدا کا بیٹا گردانتے کیوں تھے؟ صرف اس لئے کہ مریم کا کوئی شوہر نہ تھا اور لوگ سمجھتے تھے کہ مریم، خدا سے حاملہ ہو کر بچہ جنی ہے۔ جس طرح اور مذاہب میں سورج اور چاند سے عورتوں کے حاملہ ہونے کی روایات ہیں۔ اور پھر اگر مریم کے شوہر اور حضرت عیسیٰ کے باپ "یوسف" تھے ہی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کے خدا نہ ہونے کی تردید میں صرف اتنا ہی کیوں فرمایا کہ "عیسیٰ کو خدا کہنے والے کافر ہیں"؟ یہ بھی کیوں نہ کہہ دیا کہ "وہ تو یوسف کا بیٹا ہے"؟ جب رسول اللہ کے متبنّیٰ بیٹے "زید" کو لوگ "رسول اللہ کا بیٹا" کہنے لگے تھے تو اللہ تعالیٰ نے نہ صرف تردید کی تھی کہ:-

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ
(احزاب ۵۔ ع۲)

"محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کا بھی باپ نہیں ہے بلکہ وہ صرف اللہ کا رسول ہے۔"

بلکہ یہ بھی حکم دیا تھا کہ:-

اُدۡعُوۡهُمۡ لِاٰبَآئِهِمۡ "آئندہ سے لوگوں کو اُن کے باپوں کے نام سے پکارا کرو"۔
(احزاب ا- ۳۳/۵)

مگر یہاں اللہ تعالیٰ نے خود اپنے سے منسوب کئے جانے والے بیٹے حضرت عیسیٰ کے بارے میں صرف تردید ہی پر کیوں اکتفا کی؟ یہ بھی کیوں نہ کہا کہ اسکو اس کے باپ یوسف کے نام سے منسوب کرو؟ رسول کے سلسلے میں اسقدر وضاحت اور خود اپنے سلسلے میں یہ ابہام؟ آخر کیوں؟ پھر اگر حضرت عیسیٰ کی پیدائش بغیر باپ کے نہ ہوئی تھی تو اس سلسلے میں یہ یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ کے ٹکڑے کی کیا ضرورت تھی؟ اِس کا مطلب تو یہی ہے کہ جو لوگ بلا باپ کے عیسیٰ کی پیدائش کے سبب عیسیٰ کو خدا کہتے ہیں وہ خدا کی اِس قدرت کے منکر ہیں کہ وہ جس طرح چاہے تخلیق کرے۔

اِسی آیت میں حضرتِ عیسیٰ اور اُن کی والدۂ مکرمہ کی ہلاکت کا بھی ذکر ہے۔ بھلا اگر حضرتِ عیسیٰ کے باپ تھے ہی، چاہے وہ یوسف ہوں یا کوئی اور، تو ہلاکت کے سلسلے میں صرف حضرتِ عیسیٰ اور اُن کی "ماں" کا کیوں ذکر ہوا اور اُن کے "باپ" کی ہلاکت کے ذکر سے اللہ تعالیٰ نے کیوں صرف نظر کیا؟ کیا یوسف انسان نہ تھے جو "کھانا" بھی کھاتے ہوں اور "ہلاکت" کا بھی نشانہ بنیں؟ کیا وہ اللہ تعالیٰ کی ہلاک کرنے کی قدرت سے باہر تھے؟

بہر حال! اِن آیتوں سے یہ بخوبی ظاہر ہے کہ وہ دو تھے ہی۔ مریم اور عیسیٰ بس۔ ماں اور بیٹا صرف۔ تیسرا کوئی فردِ بشر نہ تھا۔ اگر حضرت مریم کا کوئی شوہر یا حضرت عیسیٰ کا کوئی "باپ" ہوتا تو کھانا کھانے کے ذکر میں ہرگز تثنیہ کا صیغہ استعمال نہ ہوتا۔ ہلاکت کے سلسلہ میں بھی قطعی اُس کو معافی نہ دی

جاتی۔ اور خدا ہونے کی تردید میں یہ ضرور ظاہر کر دیا جاتا کہ وہ "اللہ کا بیٹا" یا اللہ نہیں بلکہ "یوسف کا بیٹا" ہے۔ نہ صرف اتنا بلکہ یہاں حسبِ مشیت تخلیق کا بھی ذکر نہ کیا جاتا اور نہ دلائل پیش کرنے کے باوجود لوگوں کے اُلٹی طرف جانے کا کوئی بیان ہوتا۔

(۳)

حضرتِ عیسیٰ اور حضرتِ یحییٰ علیہم السّلام معاصر نبی" تھے۔ دونوں باہم وابستہ بھی تھے اور دونوں کا ذکر قرآن میں تقریباً ہر جگہ ساتھ ہی ساتھ ہوا ہے۔ حضرتِ یحییٰ کے ذکر میں ہے کہ:۔

وَ بَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ (مریم ۱- ۱۹/۱۴) "اور وہ اپنے باپ ماں کا خدمتگزار تھا۔"

آگے بڑھ کے۔ حضرتِ عیسیٰ کا قول نقل ہوا ہے کہ:۔

وَ بَرًّۢا بِوَالِدَتِيْ (مریم ۲- ۱۹/۳۲) "اور مجھے میری ماں کا خدمتگزار بنایا گیا ہے۔"

جب حضرتِ عیسیٰ کے بھی "باپ" اور "ماں" دونوں ہی تھے، جس طرح حضرتِ یحییٰ کے، تو پھر ایسا کیوں ہے کہ حضرتِ یحییٰ کو تو اپنے باپ اور ماں دونوں کا خدمت گذار بتایا گیا مگر حضرت عیسیٰ کا صرف وہ قول نقل ہوا جس میں اُنھوں نے اپنے کو صرف اپنی "ماں" کا خدمت گذار ظاہر کیا تھا؟ آخر انھوں نے اپنے "باپ" کے ہوتے ہوئے اُنھیں کیوں فراموش کر دیا؟ اللہ تعالیٰ اپنے سارے بندوں کو تاکیداً اور اصرار کے ساتھ بار بار حکم کرتا ہے کہ:۔

بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا "اپنے باپ ماں دونوں کے ساتھ

(بنی اسرائیل ۳- ۱۷/۲۳) احسان کرو۔"

مگر حضرتِ عیسیٰ کو کھلی چھٹی دے دیتا ہے کہ وہ اپنے "باپ" کی مطلق پرواہ نہ کریں، صرف اپنی "ماں" کا اپنے کو خدمتگذار ظاہر کریں، حالانکہ وہ "پیغمبر" ہیں؟

(۴)

حضرتِ عیسیٰؑ کے سلسلے کی دو آیتیں یہ ہیں :-

(۱) وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء ۶- ۲۱/۹۱)	"ہم نے مریم کو اور اُس کے بیٹے کو ساری دُنیاؤں کے لئے نشانی بنا دیا ہے"
(۲) وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰيَةً (مومنون ۳- ۲۳/۵۰)	"ہم نے ابنِ مریم اور اُس کی ماں کو نشانی بنا دیا ہے"

ایک جگہ پہلے ماں کا ذکر کیا بعد میں بیٹے کا۔ دوسری جگہ پہلے بیٹے کا ذکر کیا بعد میں ماں کا۔ البتہ "آیت" کا محل ایک ہی رہا۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر مریم کو شوہردار ہونے کے بعد ہی بچہ پیدا ہوا تھا اور حضرتِ عیسیٰؑ "باپ" کے نطفہ ہی سے پیدا ہوئے تھے، تو پہلے حضرتِ مریم کے بارے میں یہ کیوں کہا گیا تھا کہ :-

يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ (آل عمران ۵- ۳/۴۲)	"اے مریم! اللہ نے تجھے منتخب فرمایا اور پاک بنایا اور تجھے ساری دُنیاؤں کی عورتوں کے مقابلے میں منتخب فرمایا"

یہ خصوصی انتخاب کس لئے تھا جبکہ اُنھیں عام دستور کے مطابق شوہردار بن کے ہی بیٹا پیدا ہونا تھا؟ اور ان متذکرہ بالا دونوں آیتوں میں یہ کیوں فرمایا گیا کہ ہم نے دونوں ماں بیٹے کو بہ الفاظ دیگر اِس طریقِ پیدائش کو ساری دنیاؤں (عالمین) کے لئے "نشانی" بنا دیا؟ اگر حضرت عیسیٰ بغیر باپ کے نہیں پیدا ہوئے تو وہ دُنیا والوں کے لئے نمونہ اور سبق کیوں کر ہوئے؟ کوئی تو ان دونوں ماں بیٹے میں ایسی انفرادیت و خصوصیت ہونی چاہیئے جس کی بنا پر دُنیا اُن کو نمونہ اور سبق (آیت) سمجھے؟ آخر یحییٰ

اور اُن کی ماں کو کیوں نہ "نشانی" (آیت) ظاہر کیا گیا جبکہ وہاں یہ خصوصیت بھی تھی کہ اُن کی ماں کے بانجھ پن کو دُور کر کے اُنھیں پیدا کیا گیا تھا (مریم ۱- ۱۹/۹) (انبیاء ۲۱- ۸۹-۹۰) ؟ دراصل چونکہ حضرت عیسیٰ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے اس لئے اِن دونوں ماں بیٹے کو، نئے طریق پیدائش کی نشانی بنایا گیا تھا۔

(۵)

قرآن نے حضرت عیسیٰ کی پیدائش کو "آدم" کی تخلیق سے "ملتی جلتی" ظاہر کیا ہے (آل عمران ۳- ۵۹) اِنکے علاوہ اور کسی دوسرے انسان کی تخلیق کے بارے میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ وہ آدم کی نوعیت کی تھی۔

آدم یا سب سے پہلے انسان کی پیدائش جب بھی ہوئی ہو اور جیسے بھی ہوئی ہو، یقیناً باپ اور ماں دونوں ہی کے بغیر ہوئی اور حضرت عیسیٰ کی پیدائش یوں ہوئی کہ ماں تھیں باپ نہیں، اس طور پر عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہوئی۔ یعنی سب سے پہلے انسان اور عیسیٰ کی پیدائش کا انداز ملتا جلتا سا ہے۔ دو طرح سے انسان کی پیدائش کا ذکر قرآن میں کئی جگہ ہے:۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ (فاطر ۳۵- ۱۱)

"اللہ نے تم لوگوں کو پہلے مٹی سے پیدا کیا پھر نطفہ سے"

اگر حضرت عیسیٰ باپ ہی سے پیدا ہوئے تھے تو اُن کی پیدائش کو آدم کی پیدائش سے مماثل کیوں کہا گیا؟ اور اگر اِس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہر آدمی پیدا ہوتا ہے، اُسی طرح عیسیٰ بھی پیدا ہوئے تھے، تو پھر یہ کون ایسی خصوصیت ہے جو عیسیٰ ہی کی ہو؟ یا بطورِ خاص قابلِ ذکر ہو؟ اور پھر یہ "مثل" کیا ہوا؟ "ملتی جلتی" کیا معنی؟

(۶)

حضرت مریم کے ذکر میں ہے کہ جب اُن کو حمل ٹھہر گیا تو وہ وضعِ حمل کیلئے

اپنی قیام گاہ سے دُور ہٹ گئیں اور پھر وضع حمل کے بعد حضرتِ عیسیٰ کو لے کر اپنی سابق جگہ پر لوٹیں۔ اور جب لوگوں نے اُن کی گود میں بچّہ دیکھا تو بے حد خفا ہوئے۔ اُن کی قوم نے لعنت ملامت کرنا شروع کر دیا، وہ اُن پر بہتان دھرنے لگے۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ۔ ۔ ۔ فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ۗ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا ۝ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ۝ (مریم ۱۹ - ۲۲، ۲۷، ۲۸)

"پھر وہ حاملہ ہو گئی تو وہ اُس کو لئے ہوئے کسی دُور مکان میں چلی گئی۔ .... پھر وہ اُس کو گود میں اپنی قوم کے پاس لائی تو وہ کہنے لگے کہ اے مریم! یہ تو، تُو نے بڑے غضب کا کام کیا۔ اے ہارون کی بہن[1]! نہ تو تیرا باپ ہی بُرا تھا اور نہ تیری ماں ہی بدکار تھی کہ تُو یہ کام کر بیٹھے[2]!"

اگر حضرت مریم کو بہ حالت کنوارپن یا بغیر شوہر کے، بچّہ پیدا نہیں ہوا تھا تو لوگوں نے مریم کی گود میں بچّہ دیکھ کر، اُس پر حرامکاری کا اعتراض کیوں کیا تھا۔ اُن پر زنا کا الزام کیوں دھرا تھا؟

---

[1] لوگوں کا اعتراض اِس پر بھی ہے کہ قرآن نے مریم کو بنت عمران اور اُخت ہارون کہا ہے مگر تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا۔ تاریخ سے اگر قرآن کی کوئی بات ثابت نہ ہو تو اس کے غلط ہونے کا قطعی فیصلہ تو کسی طرح مناسب نہیں بلکہ ضرورت ہے کہ مریم کے حسب نامہ کی تحقیق کی جائے۔

[2] اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ زنا اور حرامکاری کا اولاد اور والدین دونوں ہی پر اثر پڑتا ہے اور کچھ نہ سہی تو اِتنا ہی کہ اولاد والدین کو جو کچھ کرتے دیکھتی ہے خود کرتی ہے یا اُس کو کرنا بُرا نہیں سمجھتی، نیز جو ایسا کرتا ہے اُس کے والدین کے بارے میں بھی دُنیا سمجھتی ہے کہ وہ ایسے ہی ہوں گے۔

حضرتِ مریم کو "شوہردار" ماننے اور کہنے والوں کی طرف سے فرمایا جاتا ہے کہ چونکہ مریم راہبہ (NUN) تھیں اور وہ ہیکل یعنی خانقاہ میں راہبانہ زندگی گذار رہی تھیں اور از روئے قانونِ ہیکل اور دستورِ خانقاہ، کوئی "راہبہ" نکاح نہیں کر سکتی تھی اور اہلی زندگی نہیں گذار سکتی تھی اور مریم نے شادی کر لی تھی۔ لہٰذا قوم کا اعتراض، بچّہ کی پیدائش پر نہیں بلکہ اُن کے خانقاہی زندگی چھوڑ دینے اور اہلی ازدواجی زندگی اختیار کر لینے پر تھا کہ تجھے ایسا نہ کرنا چاہیئے تھا۔ اور تو نے یہ جو کیا وہ خراب کام کیا۔

سوال یہ ہے کہ معترضین نے مریم کو، اُن کے باپ اور ماں کا حوالہ دے کر کہا تھا کہ وہ بُرے لوگ نہ تھے۔ پھر تو نے ایسا خراب کام کیوں کیا۔ بھلا جب معترضین مریم کے "والدین" کو جن کی خود اہلی زندگی کا زندہ ثبوت مریم تھیں، بطور نمونہ پیش کر رہے تھے تو یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ اُن لوگوں کا اعتراض مریم پر "حرامکاری" کا نہیں بلکہ اہلی زندگی اختیار کر لینے کا تھا؟ جب وہ مریم کے والدین کی اہلی زندگی کو غلط نہیں سمجھتے تھے تو مریم کی اہلی زندگی کو بُرا سمجھنے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی؟ اگر اہلی زندگی گذارنا کوئی خراب کام تھا تو مریم کے والدین نے خود وہی زندگی گذاری تھی، پھر ہیکل والوں نے مریم کے سامنے، اُن ہی کی زندگی کو بطور نمونہ پیش کر کے مریم کی ازدواجی زندگی کو غلط کس طرح قرار دیا؟ معترضین کا کہنا تھا کہ "تیری ماں بدکار نہ تھی"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مریم کو "بدکار" گردان رہے تھے۔ اسی لئے اُنکی "ماں" کے بدکار نہ ہونے کا ذکر کر رہے تھے۔ اگر مذہبی تصوّر کے پیشِ نظر ہیکل کی راہبانہ زندگی چھوڑنا، لوگوں کے نزدیک قابلِ اعتراض تھا تو لوگ اُسے "گناہ" یا "جرم" قرار دیتے نہ کہ "بدکاری"؟ مذہبی قیود توڑ دینا اور دینی

حدود پھاند جانا "کفر" تو کہلاتا یا کہلا سکتا ہے مگر کسی مذہب میں بھی اسے "بدکاری" سے موسوم نہیں کیا جاتا۔ مگر وہ لوگ مریم پر "بدکاری کا چارج لا رہے تھے۔ چنانچہ قرآن میں اُن کی سزا دہی کا سبب بھی یہی بیان کیا گیا ہے کہ :-

وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا۔ (نساء ۲۲ - ۱۵۶/۴) "اُن کے مریم پر بہتانِ عظیم دھرنے کی وجہ سے"۔

کیا قرآن نے بھی، اُن ہی لوگوں کی طرح اہلی زندگی گذارنے پر کیے اعتراض کو "بہتانِ عظیم" کہا ہے جبکہ قرآن اسی کا منکر ہے کہ ہم نے "رہبانیت" کو کبھی کسی پر عائد ہی نہیں کیا ؟ پھر اگر واقعی حضرتِ مریم پر "بدکاری" کا نہیں بلکہ "خانقاہی زندگی چھوڑ کر اہلی زندگی گذارنے" کا اعتراض ہوتا تو خود مریم کوئی کیفیت (EXPLANATION) دیتیں نہ کہ بچّے کی طرف اشارہ کر دیتیں ؟

فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ (مریم ۲ - ۲۹/۱۹) "سو مریم نے بچے کی طرف اشارہ کر دیا"۔

بھلا اہلی زندگی گذارنا اور نکاح کرنا مریم کا فعل تھا نہ کہ بچے کا ؟ بقول اِن حضرات کے اعتراض تو اہلی زندگی پر تھا نہ کہ بچے کی پیدائش پر۔ پھر بچے کی طرف اشارہ کیا معنی ؟ بچے کی طرف اشارہ کا مطلب ہی یہ ہے کہ اعتراض "حرامکاری" اور "بدکاری" کا تھا اس لئے اُنھوں نے بچہ کی طرف اشارہ کیا کہ اِسی بچے سے پوچھ لو کہ یہ میری بدکاری کا نتیجہ ہے یا کیا ہے۔ ؟

میں اپنی بات مستند اتھارٹی (قرآن) سے آگے بڑھانا نہیں چاہتا مگر چونکہ اعتراض کی نوعیت تبدیل کرنے میں لوگوں نے قرآن سے باہر کے لٹریچر کا بھی سہارا لیا ہے۔ لہذا میں بھی باہر ہی کے ایک لٹریچر کے ذریعہ یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ مریم پر اُن کی قوم نے "خانقاہی زندگی چھوڑنے" اور اہلی زندگی

گذارنے کی وجہ سے اعتراض نہیں کیا تھا بلکہ اُن کا اعتراض "بدکاری" کا تھا ورنہ اہلی زندگی اگر مریم نے گذاری تھی تو وہ اُن ہی ہیکل والوں کے ہاتھوں انجام پائی تھی۔ ڈاکٹر شنڈل نے "قصۂ وفاتِ یوسف" سے ایک اقتباس پیش کیا ہے، جس میں ہے کہ:-

"مریم ہیکل میں رہا کرتی تھی۔ وہاں پاکیزگی اور تقدس کے ساتھ عبادت کیا کرتی تھی اور وہ وہیں پرورش پاتی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پس جب کاہنوں نے دیکھا کہ وہ کنواری عصمت و عفّت کے ساتھ رہتی ہے اور خدا کے خوف کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہے تو وہ آپس میں کہنے لگے کہ کوئی اچھا سا آدمی تلاش کر کے اِسکی نسبت اُس کے ساتھ کر دو۔ ۔ ۔ ۔ پس اُنھوں نے فوراً قبیلہ یہودا کو بُلایا اور اُن میں سے بارہ آدمی "بنی اسرائیل" کے بارہ قبائل میں سے ایک ایک منتخب کئے اور قرعہ میں بوڑھے نیک مرد یوسف کا نام نکلا۔"

اس سے ظاہر ہے کہ خود کاہنوں ہی نے مریم کی خانقاہی زندگی کی بلندی و عظمت سے متاثر ہو کر یہ طے کیا تھا کہ مریم کی شادی کر دی جائے اور اُنھوں نے خود اپنے انتظام سے ایک عظیم تقریب منعقد کی جس میں نکاح کے لئے بارہ اُمیدوار، اپنے اپنے قبیلے کے بہترین افراد، جمع ہوئے اور خود کاہنوں نے ہی قرعہ ڈالا جس میں بوڑھے یوسف کا نام نکلا اور اُسی سے اُنھوں نے مریم کا عقد کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں مریم کی اہلی زندگی پر قوم کیسے اعتراض کر سکتی تھی؟ یوں بھی مریم کا خانقاہ چھوڑنا اور اہلی زندگی گذارنا کوئی گھنٹہ دو گھنٹہ کی بات تو ہو گی نہیں، کوئی حرامکاری

روشنی زندگی تو تھی نہیں کہ ہیکل والوں یا اُن کی قوم کو خبر نہ ہو سکے، پھر آخر انھوں نے اُسی وقت کیوں نہ اعتراض کیا جبکہ وہ خانقاہ چھوڑ کر اہلی زندگی گذارنے لگی تھیں؟ قوم نے اپنے اعتراض کو بچے کی پیدائش کے بعد کے زمانے کیلئے کیوں اُٹھا رکھا تھا؟ اگر خانقاہ چھوڑ کر اہلی زندگی گذارنا قانونِ ہیکل کے خلاف تھا تو مریم کو خود اس قاعدے کی خبر ضرور ہوگی۔ پھر جب مریم کو یہ احساس تھا ہی کہ لوگ اُن کی اہلی زندگی پر اعتراض کریں گے تو مریم نے قیام گاہ سے ہٹ کر ہی کیوں نہ نکاح کیا؟ بہرکیف یہ تصور صحیح نہیں کہ مریم راہبہ (Nun) تھیں اور یروشلم کے ہیکل میں زندگی گذار رہی تھیں۔ اور ہیکل کی زندگی گذارنے والی عورت نکاح نہیں کر سکتی تھی اور مریم نے ہیکل کی زندگی چھوڑ کر اہلی زندگی گذارنا شروع کر دیا تھا اس لئے قوم نے اُن پر اعتراض کیا تھا، جن غیر قرآنی ماخذوں سے مریم کی ہیکل کی زندگی گذارنے کا ثبوت بہم پہنچایا جاتا ہے وہی ماخذ اس خیال کی تردید بھی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نسڈل سب کچھ لکھنے کے بعد کہتا ہے کہ:۔

> مریم کے ہیکل میں پرورش پانے کی روایت بہت سی دیگر مشکوک الصحت اناجیل میں بیان ہوئی ہے مثلاً قبطی کتاب "دوشیزہ" میں لکھا ہے کہ:۔
>
> "اُس نے قمریوں کی طرح ہیکل میں پرورش پائی تھی۔۔۔۔"
>
> مگر یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔۔۔۔"

لہذا غیر قرآنی اسناد پر اعتبار کرنا اور یہ سمجھنا کہ مریم پر اُن کی قوم کا اعتراض خانقاہی زندگی چھوڑ کر اہلی زندگی گذارنے پر تھا، کسی طرح بھی درست نہیں۔ در اصل قوم کا اعتراض بچے کو دیکھ کر حرامکاری کا تھا جس کا پتہ خود انجیل سے چلتا ہے۔ سب سے پہلی انجیل کے سب سے پہلے باب میں ہے کہ:۔

"اب یسوع مسیح کی پیدائش اِس طرح ہوئی کہ جب اُسکی ماں مریم کی منگنی یوسف کے ساتھ ہوگئی تو اُن کے اکٹھے ہونے سے پہلے وہ رُوح القدس کی قدرت سے حاملہ پائی گئی۔ پس اُس کے شوہر یوسف نے جو راستباز تھا اور اُسے بدنام کرنا نہیں چاہتا تھا، چپکے سے اُس کے چھوڑ دینے کا ارادہ کیا۔" (آیت ۱۸-۱۹)

جب خود یوسف نے، جو مریم کا شوہر تھا، مریم کو حرامکار خیال کر کے مریم سے کنارہ کرلینا چاہا تھا تو دوسروں کے بارے میں یہ کہنا کس طرح درست ہو سکتا ہے کہ اُنھوں نے مریم کے بیٹے کی پیدائش کو نہیں بلکہ اُن کی خانقاہی زندگی کے چھوڑنے کو بُری نظر سے دیکھا تھا؟ بہر کیف امر سے یہی خیال بے معنی ہے کہ مریم "راہبہ" اور "تن" تھیں اور ہیکل یا خانقاہ میں تجرّد کی زندگی گزارتی تھیں۔ اور تجرّد کی راہبانہ زندگی میں کوئی ترکِ نکاح نہ کرسکتی تھی۔ کسی عورت کا تن بنا اور تن کے لئے تجرّد کی زندگی گزارنا وغیرہ موجودہ عیسائی خانقاہوں کے من گھڑت رواجی قوانین میں سے ہے۔ عہدِ ولادتِ مسیح سے بھلا اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ حضرت مسیح کے بعد بھی عیسائی خانقاہوں کے سجادوں کے لئے غیر شادی شدہ ہونے کی قید نہ تھی۔ چنانچہ "اوریجن" نے، جو عیسائیوں کا ایک فاضل مذہبی رہنما تھا، جب ۲۵۰ھ میں اپنے کو اِس لئے آختہ کرالیا تھا کہ بُرے خیالات اس کی روحانی زندگی میں مزاحم نہ ہوں تو اسکندریہ کے اسقف اعظم نے اُس سے ناراضگی کا اظہار کیا تھا اور اُسے پادری کے عہدے سے ہی ہٹا دیا تھا۔ ۳۲۵ء میں تو تمام عیسائی گرجوں نے نامردوں اور مخنثوں کو "پادری" مقرر کرنا قانوناً ممنوع قرار دے دیا تھا۔ لہذا حضرت مریم کے سلسلہ میں موجودہ قوانینِ کلیسا کو سامنے رکھنا کسی طرح مناسب نہیں۔

ہمارا ماخذ "کتاب اللہ" ہے۔ کتاب اللہ خود ہی اِس حقیقت پر سب سے بڑی شہادت ہے کہ اُس وقت یہودیوں کے یہاں اوّل تو ہیکل کی زندگی کے لئے رُہبانیت کی قید نہ تھی۔ دوسرے یہودیوں کے ہیکل میں بحیثیت مجاور یا راہبہ کوئی "عورت" کبھی لی ہی نہیں جاتی تھی۔ قرآن کہتا ہے کہ مریم کی ماں عمران کی بیوی نے، حمل کی حالت میں نذر مانی تھی کہ میرے حمل میں جو بچّہ ہے، اُسے میں خدا کے لئے آزاد رکھوں گی۔ یعنی ہیکل کی نذر کروں گی۔ اُنھیں کسی سبب سے یہ یقین تھا کہ اُنھیں "بیٹا" ہوگا اور میں اُسے ہیکل کی نذر کرسکوں گی۔ لہٰذا اُنھوں نے بلا تردد و تکلف یہ نذر مان لی تھی۔ مگر جب وضعِ حمل کے بعد اُنھوں نے نومولود کو "بیٹی" پایا تو وہ اپنی نذر کے غلط ہوجانے اور نذر پوری نہ کرسکنے پر بے حد مضطرب اور پریشان ہوئیں کہ اب کیا ہوگا؟ ۔

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ ۝ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ۝ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ فَتَقَبَّلَهَا

جبکہ عمران کی بیوی نے کہا اے میرے پروردگار میں نے نذر مانی ہے تیرے لئے اس بچّہ کی جو میرے بطن میں ہے کہ وہ آزاد رکھا جائے گا، سو تو میری اِس پیشکش کو قبول فرما کیونکہ تو بڑا سننے والا جاننے والا ہے۔[ل] پھر وہ لڑکی جنی تو کہنے لگی کہ "اے میرے پروردگار میں نے تو وہ حمل اِس طرح جنا کہ یہ لڑکی ہے" اور اللہ کو معلوم تھا ہی کہ وہ کیا جنی ہے اور یہ کہ، لڑکا، لڑکی جیسا نہیں ہوتا۔ پھر وہ کہنے لگی کہ "میں نے اس لڑکی کا نام مریم رکھا ہے اور میں اسے اور اس کی اولاد کو، شیطان مردود سے، تیری پناہ

ل یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ اِس دُعا کی قبولیت کا قرآن میں کوئی ذکر نہیں ہے۔

وَ رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ ۔۔۔ میں دیتی ہوں[1]۔ سو اُن کے رب نے اُن کو
(آلِ عمران ۳۔ ۵ ۔ ۳۲ ۔ ۳۷) خوشی سے قبول کر لیا۔

غور فرمائیے کہ اگر اُس عہد میں اور یہودیوں کے ہیکل میں کوئی "عورت" لی ہی جا سکتی تھی۔ یا مریم راہبہ اور نن بن ہی سکتی تھیں تو مریم کی ماں کو نذر کئے ہوئے حمل سے "بیٹی" کے پیدا ہونے اور اپنی مانی ہوئی نذر پوری نہ کر سکنے پر مضطرب اور پریشان ہونے اور اِس کے لئے اللہ تعالیٰ سے معذرت کرنے اور پھر مریم اور اُس کی اولاد کو شیاطین سے محفوظ رکھنے کی دُعا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ صاف ظاہر ہے کہ ہیکلِ یہود میں کوئی "عورت" نہیں لی جاتی تھی یا نہیں لی جا سکتی تھی، اِس لئے وہ پریشان ہوئیں کہ اب کیا ہوگا ورنہ "بیٹی" کی پیدائش پر وہ ہرگز معذرت خواہ نہ ہوتیں اور نہ ہرگز وہ مریم اور مریم کی اولاد کی حفاظت کی دُعا کرتیں، اگر ہیکل کی زندگی کے لئے، اُن کی زندگی ناجائز اور پیدائشِ اولاد لوگوں کے لئے غیر مباح، ناجائز اور غلط ہوتی۔ والدۂ مریم کا بیٹی کی پیدائش پر نذرِ ہیکل نہ پوری کر سکنے کی معذرت کرنا اور پھر مریم کی اولاد کی، شیطان سے حفاظت کی دُعا کرنا، کافی سے کہیں زیادہ ثبوت ہے، یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ مریم ہیکل میں راہبانہ زندگی ہرگز نہیں گذارتی تھیں۔ نیز اُنکی زندگی، قانونِ ہیکل میں ناجائز نہ تھی۔ ہیکل سے بہترین تعلقات رکھنے والے "مرد" بھی راہبانہ زندگی نہیں گذارتے تھے۔ حضرت زکریا علیہ السلام جو یہود کے پیغمبر تھے وہ ہیکل سے جیسا کچھ تعلق رکھتے ہوں گے، ظاہر ہے۔ مگر وہ بھی راہبانہ زندگی نہیں گذارتے تھے۔ اُن کی بیوی بھی موجود تھیں اور انھوں نے اولاد عطا کی جانے کی بھی بطورِ خاص دعا کی تھی اور اُن کی دُعا

---

[1] یہی آخری دُعا مقبول ہوئی۔

قبول بھی کر لی گئی تھی اور حضرت یحییٰ علیہ السلام پیدا بھی ہوئے تھے اور اس امر پر اُن کی قوم نے کبھی کوئی اعتراض بھی نہیں کیا تھا۔ خود عمران یعنی مریم کے والد، قوم کے سردار اور ہیکل کے متولی تھے۔ اُن کی بیوی ہیکل سے ایسا ہی تعلق اور اتنی ہی عقیدت و وابستگی رکھتی تھیں کہ اُنھوں نے نومولود بیٹے کو ہیکل کی نذر کر دینے کا مستحکم ارادہ کر کے، اُسے خدا کے سامنے پیش بھی کر دیا تھا مگر یہ دونوں میاں بیوی اہلی زندگی گذار رہے تھے اور اُن کے گھر مریم کی سی "بیٹی" پیدا ہوئی تھی اور مریم کی ماں نے مریم کی اولاد کے لئے بھی دعا کی تھی اور قومِ یہود نے مریم کے سامنے، ان دونوں میاں بیوی کی زندگی کو بطور نمونہ اور ماڈل پیش کیا تھا۔ پھر مریم کی قوم کو مریم کی اہلی زندگی پر کیسے اور کیا اعتراض ہو سکتا تھا جبکہ سرے سے نہ تو مریم کبھی راہبہ ہی رہی اور بنی تھیں اور نہ راہبانہ زندگی کا کوئی وجود ہی تھا؟ یہ بالکل بے بنیاد بات ہے کہ مریم کبھی راہبہ یا نن بنی تھیں اور ہیکلِ یہود میں راہبانہ زندگی گذار رہی تھیں۔ والدۂ مریم نے مریم کو نذرِ ہیکل کیا ہی نہیں اِس لئے کہ وہ "بیٹی" تھیں، بلکہ اپنی نذر پوری نہ کر سکنے کی، اُنھوں نے اللہ تعالیٰ سے معذرت کر لی تھی اور اِس کے بعد چونکہ عورت تھیں اور اپنی مانی ہوئی نذر پوری نہ کر سکی تھیں اس لئے ڈرتی تھیں کہ مریم یا اُس کی اولاد پر اِس کا کوئی وبال نہ پڑے لہٰذا انھوں نے مریم اور اُسکی اولاد کے، شیطان کے شر سے محفوظ اور اللہ تعالیٰ کی خاص حفاظت میں رہنے کی اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی جسے اللہ تعالیٰ نے بڑی خوشی سے قبول فرمایا تھا اور بوجہ احسن قبول فرمایا تھا جس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔

اندریں حالات یہ سمجھنا اور سمجھانا کہ حضرتِ مریم کی، راہبانہ زندگی چھوڑ کر اہلی زندگی گذارنے کی روش پر، لوگوں نے اُن کو لعنت ملامت کیا تھا، ہرگز

درست نہیں۔ درحقیقت لوگوں کو اعتراض اِس امر پر تھا کہ حضرت مریم سردارِ قوم عمرآن کی بیٹی تھیں اور یہ دونوں میاں بیوی اپنے اعمال و کردار کے لحاظ سے اپنی قوم میں ممتاز تھے اور ہیکل کے بھی سرپرست اور متولی تھے؛ اور مریم، حضرت زکریا علیہ السّلام کے سے پیغمبر کی کفالت و سرپرستی میں تھیں اور مریم کی شادی ہوئی نہ تھی کہ یکایک لوگوں نے مریم کی گود میں بچہ دیکھا لامحالہ یہ فرض کرلیا کہ ہونہ ہو، مریم حرامکاری اور زنا کی مرتکب ہوئی ہے اور اُسکو یہ ناجائز بچہ پیدا ہوا ہے۔ لہٰذا اُنھوں نے اُن کے پاکباز والدین کا حوالہ دے کر اُنھیں لعنت ملامت کرنا شروع کردیا اور بہتان دھرا کہ تو نے یہ نہایت ناشائستہ حرکت کی۔ وہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتے تھے کہ بغیر باپ کے بھی بچہ پیدا ہوسکتا ہے۔

متذکرۂ بالا دلائل اور قرآن کی قطعی اور حتمی شہادتوں کی موجودگی میں یہ تسلیم کرنا ممکن ہی نہیں ہے کہ حضرتِ مریم شوہردار تھیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السّلام عام دستور کے مطابق باپ کے نطفہ سے پیدا ہوئے تھے اور اندریں صورت، اِس میں شک ہی نہیں رہتا کہ حضرتِ مسیح بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔

رہی میری یہ فکر کہ حضرتِ عیسیٰ بغیر باپ کے کس طرح پیدا ہوئے؟ اور آن کا بغیر باپ کے پیدا ہونا ہرگز قانونِ قدرت کے بھی خلاف نہ تھا؟ سو اِس سلسلے میں قبل اِس کے کہ میں اپنی فکر پیش کروں ایک لطیفہ قابلِ ذکر ہے۔

مسٹر عبدالغفور گجرانوالی نے جب ارتداد کی روش اختیار کی اور وہ آریہ مذہب قبول کرکے "بابو دھرمپال۔ بی۔ اے" کہلانے لگے تو اُنھوں نے "ترکِ اسلام"

کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اکچھ دنوں کے بعد وہ پھر مسلمان ہو گئے اور "غازی محمود دھرمپال" کے نام سے بہت مشہور ہو گئے تھے۔ "ترکِ اسلام" میں اُنھوں نے قرآن پر بہت سے اعتراضات کئے تھے، جن میں سے ایک اعتراض انھوں نے یہ بھی کیا تھا کہ:۔

"قرآن کی تعلیم ہے کہ اگر ایک عورت کسی مرد کا چہرہ تک نہ دیکھے تو بھی اُس کے یہاں لڑکا پیدا ہو سکتا ہے۔ اِس بات کی شہادت حضرتِ عیسیٰ اور مریم کے قصّے سے ملتی ہے جو کہ قرآن میں اکثر جگہ موجود ہے۔ اہلِ قرآن حضرتِ عیسیٰ کو یوسف نجار کا بیٹا تسلیم نہیں کرتے جیسا کہ وہ ہے۔ بلکہ اُلٹا اُس کو بغیر باپ کے پیدا شدہ مانتے ہیں اِس بات سے قانونِ قدرت پر دھبّا اور مریم پر الزام لگتا ہے اور یہ بات بجائے ایک معجزہ کے ایک فحش بات ہو جاتی ہے۔ میری عقل اور شائستگی اجازت نہیں دیتی کہ میں حضرتِ عیسیٰ کو اُن بچّوں کے ساتھ ملاؤں جو آج کل نامعلوم باپ سے پیدا شدہ سمجھے جاتے ہیں۔ قرآن کی ایسی تعلیم سے میرا دل کھٹّا ہوا۔"

اس کا ایک جواب "نور الدین" نامی کتاب میں قادیانی عالم حکیم نور الدین صاحب نے دیا تھا، جو یہ تھا:۔

(۱) "جو اسلام، قرآن کے صحیفۂ فطرت نے ہم کو سکھایا ہے اُس میں تو کہیں نہیں لکھا کہ تم اسلام لاؤ کہ مسیح بے باپ تھے؟

(۲) ہم کو نبی کریم نے نہیں فرمایا کہ اسلام میں یہ بھی ہے کہ تم مان لو کہ مسیح بے پدر تھا۔؟

(۳) ہمارے پیارے صحابۂ کرام اور ہمارے ائمۂ اربعہ فقہا اور دیگر

آئمہ عظام نے ہمیں کہیں ہدایت تو نہیں کی کہ اسلامی ضروریات سے ہے کہ مان لو مسیح بے باپ تھا؟

(۴) ہم کو ہمارے صوفیائے کرام نے اپنی تعلیمات میں کہیں تاکید نہیں فرمائی کہ اسلام میں قربِ الٰہی کے مدارج و مسالک و اصلاحِ نفس وحصولِ اخلاقِ فاضلہ کے لئے لابُد ہے کہ یہ یقین کر و کہ مسیح بے باپ تھے؟

(۵) مسیح علیہ السّلام کے ماسوا کس قدر انبیاء و رُسُل اور اللہ تعالیٰ کے ناموز گذرے ہیں کسی کا نسب نامہ قرآن میں لکھا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ۔ پس سب کے وجود کا علم بھی ضروری نہیں چہ جائیکہ وہ کس طرح پیدا ہوئے؟۔

پھر جب یہ مسئلہ اسلام کا جزو نہیں تو یہ مسئلہ تم کو باعثِ ترکِ اسلام کیوں ہوا؟ عام تحقیقات کے مسائل میں یہ مسئلہ بھی ہے۔۔۔۔"

دوسرا جواب مولوی ثناء اللہ صاحب کا "ترک اسلام کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اُنھوں نے جواب دیا تھا کہ:۔

"بیشک قرآن شریف بلکہ انجیل سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح بے باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ یوسف نجار کے نطفے سے پیدا ہونا نہ تو قرآن شریف سے ثابت ہے نہ انجیل سے۔ صرف آپکے خیالات کا مضمون ہے۔ اگر خلافِ قانونِ قدرت کا خیال ہو، تو اُصول موضوعہ ۲ دیکھو"

کتاب کے شروع میں "مقدمہ جوابات" کے عنوان سے چودہ ۱۴ اُصول موضوعہ قائم کئے گئے تھے جن میں سے اصول موضوعہ ۲ " یہ تھا:۔

"مخلوق سب کی سب ضرور "قانونِ قدرت" سے وابستہ ہے۔ اگر کوئی واقعہ کیسا ہی بعید المدّت، ہزار ہا سال نہیں، لاکھہا بلکہ کروڑہا سالوں بعد بھی کیوں نہ ہو، ضرور ہے کہ اُس کے لئے بھی کوئی نہ کوئی "قانون" ہوگا۔ جب کبھی کسی وقوعہ کا علم ہو، خواہ دیکھنے سے ہو یا صحیح خبر سے، ہم اُس کو "خلافِ قانون" نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ یہ کہیں گے کہ اُس کے لئے بھی کوئی "قانون" ہوگا۔ مثلاً عام قانون ہے کہ حیوانات کی بھی دو آنکھیں ہوتی ہیں مگر لکھنؤ کے عجائب خانہ میں اِس وقت بھی بکری کے ایک بچّہ کی شبیہ موجود ہے جس کی دو آنکھوں کے بجائے صرف ایک ہی آنکھ ہے وہ بھی پیشانی پر۔ مگر یہ کوئی "خلافِ قانون" نہیں بلکہ ہم کہیں گے کہ اُس کا بھی کوئی "قانون" ہے گو ہمیں اُس کی اطّلاع نہ ہو۔"

یہ وہی جواب ہے جو ایک طبیعات کے جرمن پروفیسر اور نامور محقق طبیعات "MAX PLANCK" نے اپنی ایک کتاب میں دیا ہے اور جسے حضرت علّامہ غلام احمد صاحب پرویز نے اپنی مُقتدر کتاب "معارف القرآن" جلد سوم کے مقدّمہ (صفحہ ۳۵) میں نقل فرمایا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

"ہمیں ایسا فرض کر لینے کا کوئی حق نہیں کہ کوئی خاص قوانینِ فطرت موجود ہیں یا یہ کہ اگر کوئی خاص قوانین اِس وقت تک موجود تھے تو وہ آئندہ بھی اُسی طرح رہیں گے۔ یہ بات بالکل سمجھ میں آنے والی ہے کہ کسی سہانی صبح، فطرت کسی ایسے خلافِ توقع واقعہ کو ظہور میں لے آئے جس سے ہم سب ہکّا بکّا رہ جائیں اور اگر ایسا ہو جائے تو ہم بے بس ہوں گے کہ اُس کے خلاف کوئی

اعتراض کر سکیں خواہ اس کا نتیجہ یہ ہی کیوں نہ ہو ۔۔۔ ۔۔ کہ ہم اپنی کوششوں کے باوجود اس انتشار میں کوئی نظم نہ پیدا کر سکیں، ایسے حالات میں سائنس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوگا کہ وہ اپنے دیوالیہ ہونے کا اعلان کر دے۔"

اب آیئے بغیر باپ کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے سلسلہ میں جو کچھ اب تک میں نے سمجھا ہے عرض کرتا ہوں، تمام واقعات پر ایک غائر نظر ڈالئے۔

زوجہ عمران اور والدہ مریم جب اپنی مانی ہوئی نذر پوری نہ کر سکیں تو ڈریں کہ کہیں مریم کی جان پر اس کا وبال نہ پڑے اور انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ تو مریم اور اُس کی اولاد کو شیطان کے شر سے اپنی پناہ میں رکھیو۔ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو بوجہ احسن قبول کر لیا۔ یوں کہ اس نے اپنی حکمت تخلیق کو نئی شکل میں پیش کرنے اور اپنے قانون پیدائش کی منفرد نمائش کے لئے بطور خاص مریم اور اُس کی اولاد کو منتخب کر لیا اور اُن کی بہترین پرورش و پرداخت اور پاکیزہ سیرت کا اعلیٰ معیار قائم کرنے کے لئے، انھیں، اپنے ایک برگزیدہ بندے حضرت زکریا علیہ السلام کی تربیت و نگرانی میں دے دیا:-

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَّ اَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ	"سو اُن کے رب نے اُن کو بخوشی قبول کر لیا اور بہترین طریقہ پر اُن کی پرورش و پرداخت کے لئے ہم نے اُن کو زکریا کی کفالت میں دے دیا۔"
(آل عمران ۴- ۳/۳۷)	

چونکہ وہ عمران کی بیٹی تھیں جو اپنی برگزیدگی (۳/۳۳) کی بنا پر یہود کے سردار

اور ہیکل کے متولی اور سرپرست تھے اور اُن کی پرورش حضرت زکریّا کے تعلق تھی جو پیغمبر تھے۔ لہٰذا مریم کا زیادہ وقت عبادت و ریاضت میں گذرتا تھا۔ اس طرح یہ اُن کا انداز و کردار مثالی و معیاری قرار پا گیا۔ تاآنکہ وہ اِس طور پر سِن بلوغ کو پہنچ گئیں یکایک ایک دن اُنھیں فرشتوں کے ذریعہ خبر سنائی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو بمقابلہ تمام عورتوں کے ایک خاص کام کے لئے منتخب کیا ہے اور مشیّتِ الٰہی یہ ہے کہ ایک بیٹا دیا جائے گا جو مسیح عیسیٰ بن مریم کہلائے گا۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ	"جب کہ فرشتوں نے کہا کہ اے مریم! اللہ
اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ	تعالیٰ تم کو خبر دیتا ہے ایک کلمہ کی جس کا نام
مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ	مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا۔ باوقار ہوگا۔
مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا	دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور وہ
وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝	اُن لوگوں میں سے ہوگا جو بہرے قریب
(آل عمران ۵۔ ۴۵)	رہنے والے ہیں"

مریم کنواری تھیں، پاکباز تھیں اور خدا کی فرمانبردار باندی تھیں۔ اُنھوں نے جو یہ عجیب و غریب خبر سُنی تو وہ بے حد گھبرائیں۔ نہ کوئی آدمی، نہ کوئی خبر دہندہ بس ایک آواز آرہی ہے۔ سمجھ گئیں کہ یہ خدا کی طرف سے خبر دی جا رہی ہے۔ لہٰذا مضطربانہ کہنے لگیں:-

رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ	"اے میرے پروردگار!" بھلا مجھے لڑکا
يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكِ	کیسے ہوسکتا ہے جبکہ مجھے کسی بشر نے مس نہیں
اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ	کیا ہے؟" کہا گیا کہ "ایسا تو ہو کے رہے گا اللہ
(آل عمران ۵۔ ۴۷)	جس طرح چاہے پیدا کرے"۔

بات ختم ہو گئی۔ یعنی مریم کے اس اعتراض پر کہ ہم کو تو کسی بشر نے مس نہیں کیا ہے

پھر مجھے لڑکا کیسے ہوگا؟ صرف یہ جواب دیا گیا کہ 'یہ تو طے پا چکا ہے کہ ایسا ہی ہوگا اور یہ تو اللہ کی مرضی ہے کہ وہ جس طرح چاہے پیدا کرے'۔ دن گذرتے رہے تا آنکہ وقت آگیا، جب مشیتِ الٰہی نے ایسا کرنا طے کیا تھا چنانچہ ایک دن ہوا یہ کہ:-

مَرْيَمَ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا
مَكَانًا شَرْقِيًّا ۝ فَاتَّخَذَتْ
مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا فَأَرْسَلْنَا
إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا
بَشَرًا سَوِيًّا ۝ قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ
بِالرَّحْمَٰنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ
تَقِيًّا ۝ قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ
رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا ۝
قَالَتْ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ
وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ وَلَمْ
أَكُ بَغِيًّا ۝ قَالَ كَذَٰلِكِ قَالَ
رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَلِنَجْعَلَهُ
آيَةً لِلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِنَّا وَكَانَ
أَمْرًا مَقْضِيًّا ۝

(مریم ۱۹/۲ — ۱۶-۲۱)

مریم جبکہ اپنے گھر والوں سے الگ ہو کر مکان کے پورب کے حصہ میں گئی اور وہ پردہ کی جگہ میں اکیلی ہوئی تو اُس کے پاس ہم نے اپنی روح کو بھیجا کہ وہ اُس کے لئے ایک پورے آدمی کی شکل بن گیا۔ مریم اُس کو دیکھ کر کہنے لگی کہ اگر تو خدا سے ڈرتا ہے تو میں تجھ سے خدا کی پناہ چاہتی ہوں"۔ اُس نے کہا: "میں تو تیرے پروردگار ہی کا بھیجا ہوا تیرے پاس اس لئے آیا ہوں کہ تجھے ایک پاکیزہ بیٹا بخشوں"۔ مریم کہنے لگی کہ "مجھے لڑکا کس طرح ہوگا جبکہ مجھے کسی مرد نے چھوا تک نہیں ہے؟ اور نہ بدکار ہی ہوں؟" اُس نے کہا ایسا تو ہو کے رہے گا تیرے رب کا کہنا ہے کہ ایسا کرنا میرے لئے بہت آسان ہے اور ایسا اس لئے ہوگا تاکہ ہم اُسے تمام بنی نوع انسان کے لئے ایک "آیت" بنادیں اور ایک خاص رحمت کا نمونہ اپنی طرف سے اور یہ تو ایک طے شدہ امر ہے"۔

یہ دونوں واقعے دو مختلف وقتوں کے ہیں۔ پہلے موقع پر حضرتِ مریم کو صرف اطلاع دی گئی تھی اور کہنے والے، مریم کے سامنے نہ گئے تھے جو "ملائکہ" (فرشتے) تھے۔

اسی لئے اُنھوں نے اپنے عذر میں خود اللہ تعالیٰ کو مخاطب کیا تھا اور صرف بے مرد سے ملے ہوئے بچے کی پیدائش پر اظہار حیرت کیا تھا مگر دوسرے موقع پر اُنکے سامنے خدا کا ایک فرستادہ ایک پورے "مردؔ" کے انسانی ہیکل میں سامنے کھڑا تھا جسے "روح" کہا گیا ہے، مریم سے اور اُس سے دو بدو باتیں ہو رہی تھیں، مخاطب کا کہنا تھا کہ میں تمھیں وہ لڑکا دینے آیا ہوں جس کی اطلاع تم کو اب سے بہت پہلے دی جا چکی ہے، لہٰذا مریم نے نہ صرف شوہر دار نہ ہونے کا عذر کیا بلکہ اپنے حرامکار نہ ہونے کا بھی ذکر کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ میں شوہر دار نہیں ہوں اور نہ بدکار ہی ہوں؟ جواباً مخاطب نے کہا کہ ایسا ہی ہونا تمہارے پروردگار نے طے کر دیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ وہ اس نوع کی پیدائش کو تمام بنی نوع انسان کے لئے ایک نمونہ اور نشانی بنانے والا ہے"۔

حضرت مریمؑ حضرتِ زکریاؑ کی کفالت و سرپرستی میں تھیں اور دونوں کا قصہ تقریباً ہر جگہ ساتھ ہی ساتھ بیان ہوا ہے، یہانتک کہ حضرتِ زکریاؑ کے یہاں حضرتِ یحییٰؑ اور حضرتِ مریم کے یہاں حضرتِ عیسیٰؑ چھ ماہ آگے پیچھے پیدا بھی ہوئے۔ حضرتِ زکریاؑ کو اُن کے طلب کرنے پر اور حضرتِ مریم کو بے طلب پہلے ہی اطلاع بھی دے دی گئی تھی کہ تم کو بیٹا ہوگا۔ چنانچہ جب حضرتِ زکریاؑ کو اطلاع دی گئی تھی تو اُنھوں نے بھی اظہارِ حیرت کیا تھا کہ:-

اِمْرَاَتِیْ عَاقِرٌ (آل عمران ۴ ۳/۴۰) "میری بیوی تو بانجھ ہے؟"

جواب ملا تھا کہ کَذٰلِکَ یعنی "ایسا تو ہو کے رہے گا"۔ اِس جگہ "تخلیق" کے سلسلے میں کسی خدائی اختیار کا مطلقاً کوئی ذکر نہیں ہے۔ حضرتِ مریم کو بھی جب بیٹا کی خبر دی گئی تھی تو اُنھوں نے بھی اس پر تعجب کیا تھا کہ:-

---

لہ اِس فرستادۂ الٰہی نے "مرد" ہی کی شکل کیوں اختیار کی؟ اس لئے کہ وہ اللہ کا "رسول" تھا۔ "اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکِ" اور اللہ کا "رسول" ہمیشہ "مرد" ہوا کرتا ہے۔ اِلَّا رِجَالاً (۱۲/۱۰۹)

وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ (آل عمران ۵۔ ۴۷) "مجھے تو کسی مرد نے چھوا تک نہیں ہے؟"

اُن کو بھی جواب ملا تھا کہ "کَذٰلِکِ" یعنی "ایسا تو ہو کے رہے گا" مگر ساتھ ہی جواب کا جزو بھی جوڑ آگیا تھا کہ "اَللّٰہُ یَخْلُقُ مَا یَشَاءُ" یعنی "اللہ جس طرح چاہے پیدا کرے"۔ پھر سورۂ انبیاء میں بھی دونوں کا ساتھ ہی ساتھ ذکر ہوا ہے۔ وہاں حضرتِ زکریاؑ کی بیوی کے سلسلے میں، جن کے بانجھ ہونے کا حضرتِ زکریاؑ نے ذکر کیا تھا، آیا ہے کہ:۔

اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ (انبیاء ۔۔ ۹۰) "اُس کی بیوی میں، اُس کے لئے ہم نے صلاحیت پیدا کر دی۔"

مگر حضرتِ مریم کے سلسلے میں، یہاں، وہاں یا اور کہیں بھی، اِس امر کا مطلقاً کوئی ذکر نہیں کہ جس طرح حضرتِ زکریاؑ کی بیوی کی حالت میں اصلاح و تبدیلی کی گئی تھی، اُسی طرح حضرتِ مریم کی حالت میں بھی کوئی تغیر و تبدل کیا گیا تھا بلکہ اِس کے خلاف شہادت ملتی ہے کہ اُن کی سابقہ حالت بدستور باقی رکھی گئی تھی۔ جس وقت پہلے پہل مریم کو بیٹا پیدا ہونے کی خبر دی گئی تھی، اُس وقت وہ حضرتِ زکریاؑ کی سرپرستی و نگرانی میں، زہد و عبادت کی زندگی گذار رہی تھیں اور اُنھیں اُس اندازِ حیات اور روزمرۂ زندگی کو بجنسہٖ اور بدستور باقی و قائم رکھنے کا حکم دیا گیا تھا۔

يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (آل عمران ۵۔ ۴۳) "اے مریم! تُو اپنے پروردگار کی اطاعت گذار رہ اور رکوع و سجود کیا کر، رکوع و سجود کرنے والوں کے ساتھ۔"

گویا اُنھیں تاکید تھی کہ وہ اپنی عبادتی و ریاضتی "روٹین" بدستور رکھیں گی جو کچھ ڈیلی پروگرام اُن کا ہے وہ علیٰ حالہٖ باقی رہے گا۔ قرآن میں کسی جگہ بھی کوئی

اشارہ تک نہیں ہے کہ انھیں اپنی موجودہ زندگی کو چھوڑ کر کوئی نئی زندگی اختیار کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور اُن کی حیات میں کوئی تبدیلی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جبکہ وہ کنواری تھیں اور انھیں کسی مرد سے جنسی مقاربت نہ ہوئی تھی، انھیں لڑکا پیدا ہونے کی خبر سن کر کیا کچھ نہ تعجب و اضطراب ہوا ہوگا۔ چنانچہ جس وقت وہ فرستادۂ الٰہی، مریم کے پاس تنہائی و بے پردگی کی حالت میں، مرد کی شکل اختیار کر کے ظاہر ہوا اور اس نے یہ کہا کہ "میں تم کو لڑکا دینے آیا ہوں" تو وہ گھبرا گئیں اور اُنھوں نے پھر وہی عذر کیا کہ "میں شادی شدہ تو ہوں نہیں اور نہ ہی میں زناکار ہوں، پھر مجھے لڑکا کیسے ہوگا؟" اُس نے جواب دیا کہ "یہ درست ہے کہ تم شوہردار نہیں، یہ بھی صحیح ہے کہ تم حرامکار بھی نہیں، یہ بھی ٹھیک ہے کہ تم کو کسی مرد نے چھوا تک نہیں ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ مرد سے ملے بغیر کسی عورت کو لڑکا پیدا نہیں ہوا کرتا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تمھارے پروردگار نے تم کو ایک خاص مقصد سے منتخب کیا ہے وہ یہ کہ تم کو اس طرح ایک بیٹا دیا جائے کہ وہ "پیدائش" تمام بنی نوع انسان کے لئے ایک نمونہ بن جائے اور اسی طے شدہ پروگرام اور اٹل فیصلے کے مطابق میں آج، اس وقت تمھیں وہ بیٹا بخشنے آیا ہوں۔

یہاں سورۂ مریم میں قرآن خاموش ہے کہ اُس فرستادۂ الٰہی نے مریم کو بیٹا عطا کرنے کی کیا ترکیب کی؟ نہ پھر مریم ہی کے کسی احتجاج کا ذکر ہے بلکہ صرف نتیجہ کی خبر دی گئی ہے کہ "فَحَمَلَتۡهُ" سو اُس کو حمل ٹھہر گیا۔ ظاہر ہے کہ طریقِ کار کے طور پر اس فرستادۂ الٰہی نے مریم پر کوئی عمل ایسا ضرور کیا جو استقرارِ حمل کا باعث ہوا ورنہ اُسے انسان اور مرد کا پیکر اختیار کر کے تنہائی و بے پردگی کی حالت میں مریم کے سامنے حاضر و ظاہر ہونے

کی کیا ضرورت تھی ؟ نیز اس مقام پر حصر ہے کہ وہ فرستادہ مریم کے لئے آدمی کی شکل بنا۔ یعنی اُس کو مریم کو بیٹا عطا کرنے کے سلسلے میں ایک آدمی کی صورت ضرورتاً اختیار کرنا پڑی تھی۔

بشارت واطلاع تو بہت پہلے مریم کو دی ہی جا چکی تھی اور اُس وقت خبر دینے والے فرشتے اُن کے سامنے ظاہر نہ ہوئے تھے اُنھوں نے کوئی شکل اختیار نہیں کی تھی، بلکہ اُنھوں نے صرف حکم الٰہی مریم کو پہنچا اور سُنا دیا تھا، اِسی لئے مریم نے اُس موقع پر اللہ تعالیٰ ہی کو مخاطب کر کے احتجاج کیا تھا۔ مگر اِس دفعہ ایک فرستادۂ الٰہی آدمی کی شکل میں مریم کے سامنے کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا کہ "میں پہلے دی ہوئی اطلاع کے مطابق، تمھیں وہ بیٹا دینے آیا ہوں"۔ اِس سے لامحالہ یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اِس گفتگو کے بعد اُس فرستادۂ الٰہی نے کوئی خدمت ضرور انجام دی، کوئی عمل یقیناً کیا، اور کوئی کارروائی لازماً ایسی کی جس کے نتیجے میں مریم کو حمل قرار پا گیا۔ سورۂ تحریم میں اِس سلسلے کا ذکر یوں ہے :-

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ۝
(تحریم ۱۲ — ۶۶)

"اور عمران کی بیٹی مریم، جس نے اپنی شرمگاہ محفوظ رکھی تھی، سو ہم نے اس میں اپنی روح میں سے نفخ کر دیا تھا اور اُس نے اپنے پروردگار کے "کلمات" اور "کتاب" کی تصدیق کی تھی۔ کیونکہ وہ تھی ہی اطاعت شعاروں میں سے"۔

اور پھر سورۂ انبیا میں ہے کہ :-

وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا

"اور وہ جس نے اپنی شرمگاہ محفوظ رکھی تھی

فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا — سو ہم نے اُس میں اپنی روح میں سے نفخ
وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً — کر دیا تھا اور اُس کو اور اُس کے بیٹے کو
لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ — ساری دُنیاؤں والوں کے لئے نشانی اور
(انبیاء ۲۱ - ۹۱) — نمونہ بنا دیا تھا۔"

یہ دونوں آیتیں بہت ہی اہم ہیں اور انھیں کو سمجھنا اور سمجھانا ہے۔ غور فرمائیے۔ اِن ہی آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس فرستادۂ الہیٰ نے مریم کے ساتھ کیا کیا تھا جس سے استقرارِ حمل ہوا تھا۔

اِس آیت میں یہ حصر ہے کہ مریم نے اپنی شرمگاہ محفوظ رکھی تھی یعنی نہ تو مریم کا کوئی شوہر تھا اور نہ کبھی بھی ہوا۔ نہ اُس نے حرامکاری کی کہ اُس سے کوئی مرد ملتا۔ اور نہ ہی وہ فرستادۂ الہیٰ، جو مریم کے سامنے آدمی کی شکل بن کر حاضر ہوا تھا، مریم سے ہمبستر ہوا۔ بلکہ ہوا یہ کہ اُس نے کوئی شے جسے قرآن نے لفظ "روح" سے ظاہر کیا ہے، کسی خاص طریقہ پر، باہر سے مریم کے رحم میں داخل کر دی تھی۔ "فَنَفَخْنَا فِيْهِ" میں "فِيْهِ" کی ضمیر کا مرجع سوائے "فرج" کے کوئی اور نہیں۔ اور اِس کا مطلب بجز اسکے اور کچھ نہیں کہ اُس فرستادۂ الہیٰ نے کوئی شے باہر سے مریم کے رحم میں داخل کر دی تھی جس سے مریم کو حمل قرار پا گیا تھا چونکہ یہ ایک عمل (APPLICATION) کی چیز تھی اِس لئے اِس موقع پر فرستادۂ الہیٰ کو انسانی پیکر اختیار کر کے، ایسے موقع پر مریم کے سامنے حاضر و ظاہر ہونا پڑا تھا جبکہ وہ ضرورتاً خلوت میں تنہا اور بے پردہ تھیں چنانچہ اُس کے اِس عمل سے مریم حاملہ ہو گئیں اور پیدائش اولاد کا یہ ایک طریقہ، محض تفریحاً نہیں برتا گیا تھا۔ اِسی سورۂ انبیاء میں پہلے ہی یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ:-

لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ (انبیاء ۱۔ ۲۱/۱۷)

"اور اگر ہم کو لہو و لعب ہی کرنا ہوتا اور ہم یوں ہی فعل عبث کرنے والے ہوتے تو ہم اپنے پاس ہی کی چیز کو مشغلہ بنا لیتے۔"

بلکہ مقصد یہ تھا کہ یہ واقعہ بطور "نشانی" لوگوں کے سامنے آئے۔ اس کو لوگ "نمونہ" قرار دے کر تحقیق و تدقیق اور تلاش و جستجو کریں۔ یہ آیت سورۂ انبیاء میں ہے جس میں تخلیق عیسیٰ کو "اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" فرمایا گیا ہے اور جو اوپر پیش ہو چکی ہے اور اس واقعہ کے "آیت" ہونے کا صرف یہیں ذکر نہیں ایک ہی جگہ بیان نہیں، بلکہ تین تین جگہ ذکر ہے، بار بار دہرایا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کو اصرار ہے کہ یہ طریق کار اس لئے اختیار کیا گیا، یہ واقعہ اس لئے ظہور پذیر ہوا۔

(۱) لِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ (مریم ۲۔ ۱۹/۲۱)

"تاکہ اسے تمام بنی نوع انسان کے لئے آیت بنا دیا جائے۔"

(۲) جَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰيَةً (مومنون ۳۔ ۲۳/۵۰)

"ہم نے ابن مریم اور اس کی ماں کو آیت بنا دیا۔"

(۳) جَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء ۶۔ ۲۱/۹۱)

"ہم نے اس کو اور اس کے بیٹے کو ساری دنیاؤں والوں کے لئے آیت بنا دیا۔"

یہاں "آیت" کے معنی "معجزہ" نہیں ہو سکتے آپ اسے کس کا معجزہ قرار دیں گے مریم کا؟ عیسیٰ کا؟ قرآن نے تو دونوں ماں بیٹے کو، بجائے خود آیت بنانے کا ذکر کیا ہے؟ اس کے علاوہ "معجزہ" تو اپنے مخاطبین و مخالفین سے اپنی صداقت منوانے کے لئے کوئی "پیغمبر" ہی دکھلاتا ہے اور "مریم" "نبی" نہ تھیں کہ انھیں معجزہ دکھانے کی کسی کو ضرورت تھی اور وہ لوگوں کو یہ معجزہ دکھاتیں کہ

دیکھو میں بغیر مرد سے ملے بیٹا پیدا کر سکتی ہوں۔ کوئی "عورت" کبھی نبی اور "رسول" ہوئی ہی نہیں۔ آنحضرت سے بار بار کہا گیا تھا کہ ہم نے ہمیشہ "مردوں" ہی کو "رسول" بنایا ہے:۔

(۱) لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً (رعد ۶۔ ۱۳/۳۸) — "بیشک ہم نے تم سے پہلے بھی رسول بھیجے تھے جن کی بیویاں بھی تھیں اور اُن کو اولاد بھی تھی"

(۲) مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا — "ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر یہ کہ مرد"

(یوسف ۱۲-۱۰۹، نحل ۶۔ ۱۶/۴۳، انبیاء ۱۔ ۲۱/۷)

حضرتِ عیسیٰ بے شک "نبی" تھے مگر آپ کی یہ عجوبہ پیدائش، خود اُن کا معجزہ تو نہیں ہو سکتی کیونکہ پیغمبر اپنی سچائی منوانے کے لئے پیدائش نہیں بلکہ بعثت کے بعد معجزہ دکھلاتا ہے جیساکہ خود اُنھوں نے بعثت کے بعد دکھلایا تھا۔ نیز حضرتِ عیسیٰ کی بعثت اور نبوت و رسالت "ساری دُنیا والوں" کے لئے تو تھی نہیں بلکہ صرف ایک مخصوص قوم "بنی اسرائیل" کے لئے تھی۔ چنانچہ اُن کی پیدائش سے پہلے، بشارت ہی کے وقت حضرت مریم سے کہدیا گیا تھا کہ جس بچے کے پیدا ہونے کی تم کو خبر دی جا رہی ہے" بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کے بھیجا جائے گا:۔

وَ رَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (آل عمران ۵۔ ۳/۴۹) — "اور اُس کو بھیجا جائے گا بنی اسرائیل کی طرف"

پھر پیدائش کے بعد، خود حضرتِ عیسیٰ نے بھی اعلان فرمایا تھا کہ:۔

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ — "اے بنی اسرائیل! میں اللہ کا رسول ہوں۔

اِلَیۡکُمۡ (الصّف ۔ ۶) اور تمہاری طرف بھیجا گیا ہوں۔[1]

ظاہر ہے کہ اس صورت میں، ان کی بغیر باپ کی پیدائش بطور معجزہ ہوتی تو حضرت بنی اسرائیل کے لئے ہوتی جنہیں اُن کی صداقت و نبوت پر ایمان لانا تھا، مگر متذکرہ بالا آیتوں میں اس انوکھی پیدائش کے ذکر کو، تمام ضروری تفصیلات کے ساتھ ہمیشہ باقی اور موجود رہنے والے قرآن میں جو، ذکریٰ للعٰلمین (۶/۹۰) "ساری دنیاؤں والوں کے لئے نصیحت اور سبق" اور بصائر للناس (۴۵/۲۰) "تمام بنی نوع انسان کی بصیرت و دانائی کا سرچشمہ" ہے اٰیۃ للعٰلمین و "اٰیۃ للناس" فرمایا گیا ہے، لہذا بے شک و ریب یہاں "آیت" کا مطلب عبرت نمونہ، سبق، نشانی، دلیل اور برہان ہے۔ یعنی یہ واقعہ ساری دنیاؤں والوں اور تمام بنی نوع انسان کے لئے ایک عنوانِ فکر، ایک نقطۂ تحقیق، ایک موضوعِ تلاش وجستجو اور ایک علمی وسائنسی طریقِ عمل بنایا گیا تھا اور اسکی یہ حیثیت ہنوز قائم اور بدستور باقی ہے۔ چاہیئے تھا کہ مسلمان اہل حکمت وسائنس اس طرف توجہ کرتے اور بالآخر فکر وجستجو کے ذریعے وہ "شے" تلاش کر لیتے جو خارج میں یقیناً موجود ہے اور جسے اس فرستادۂ الہٰی نے استقرار حمل کیلئے حضرت مریمؑ کے تندرست رحم میں باہر سے داخل کر دیا تھا اور انھیں حمل قرار پاکر ایک تندرست معیاری بچہ پیدا ہوا تھا۔ "آیات" ہمیشہ غور و فکر تحقیق و تلاش مطالعہ و مشاہدہ اور تلاش وجستجو کے لئے ہوتی ہیں۔ پورا قرآن اس طرح کی آیات سے بھرا ہوا ہے:-

لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ۔ "نشانیاں غور وفکر کرنے والی قوموں کے لئے ہوتی ہیں"

(۶/۱۲، ۲/۲۶، ۱۰/۲۴، ۱۳/۳ ، ۱۶/۱۱، ۴۴/۶۹ ، ۳۹/۴۲ ، ۴۵/۱۳ ، ۵۹/۲۱) وغیرہ۔

---

[1] اس سے اس امر کی بھی تردید ہو جاتی ہے کہ حضرت عیسیٰ ہندوستان کے کشمیر میں آئے مرے اور دفن ہوئے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش و بعثت، بنی اسرائیل کے اس طبقہ یا فرقہ میں ہوئی تھی جو "عیسینی" (ESSENE) کہلاتا تھا، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ لفظ "عیسیٰ" اور "عیسائی" اسی "عیسینی" سے ممکن ہے نکلا ہو۔ مگر یہ بات ماننے کی یوں نہیں کہ پیدائش عیسیٰ سے بہت پہلے، جس وقت مریم کو بشارت پسر دی گئی تھی۔ اسی وقت اس بچے کو "مسیح عیسیٰ ابن مریم" کہا گیا تھا۔ اگر حضرت مسیح کی پیدائش کے بعد والی آیتوں میں یہ لفظ آتا تو بات کسی حد تک قابلِ تسلیم تھی۔ بہرکیف اندازہ یہ ہے کہ زوالِ بابل کے بعد جب یہودیوں پر حسرت و مایوسی چھا گئی تو اُن میں یہ فرقہ پیدا ہوا۔ کیونکہ اس فرقہ کی جو کچھ حالت مورخ جوزیفس نے "محاربۂ یہود" میں لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرقہ قریب قریب "بودھ مذہب" کا سا تھا۔ یہ فرقہ پڑھا لکھا، جفاکش اور محنتی ہونے کے ساتھ ساتھ طبابت و حذاقت میں شہرۂ آفاق تھا۔ یہ لوگ امراض اور اُن کے اسباب اور اُن کے علاج کی تحقیق و تدقیق میں بڑے ماہر اور ممتاز واقع ہوئے تھے۔ حضرت عیسیٰ اسی فرقہ کی صحیح رہنمائی کے لئے مبعوث ہونے والے تھے۔ لہذا اُن کی پیدائش ہی ایک جدید سائنٹفک طریقے پر عمل میں آئی اور پھر پیدائش و بعثت کے بعد انھوں نے خود جب قدرتی معجزات پیش کئے۔ اُن کا تعلق بھی طبابت وحذاقت اور سائنس کے اسی شعبے سے تھا۔ سورۂ آل عمران (۳، ۴۹) میں معجزاتِ عیسیٰ کا تفصیلی ذکر آیا ہے۔ یعنی:-

(۱) مٹی سے پرندوں کی شکلیں بنانا اور ان کو پھونک مار کر جاندار بنا دینا
(۲) مبروص کو تندرست اور چنگا کر دینا۔
(۳) اندھے کو بینا کر دینا۔

(۴) مُردہ کو زندہ کر دینا۔
(۵) غذا کی نوعیت و حالت بتا دینا۔

یہ سارے کے سارے معجزات صرف طبابت و حذاقت یعنی سائنس کے ایک خاص شعبے سے تعلق رکھتے ہیں کیوں کہ حضرتِ عیسیٰ کو ابتداً اُس خطۂ ارض کے اسرائیلیوں کو پیغامِ الٰہی پہنچانا تھا جہاں یہ فن معراجِ کمال پر تھا اور اُن کی صحیح رہنمائی کوئی بھی جو فنِ طب میں مہارتِ کامل رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب تک عوام اپنوں میں سے کسی کو سب سے زیادہ بہتر نہیں پاتے اُسے اپنا رہنما اور ہادی نہیں مان سکتے۔ اس کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی اناجیل لکھنے والوں میں بھی بعض اِس فن کے ماہر تھے۔ مثلاً "لوقا" کہ "انطاکیہ" کا ایک اچھا طبیب تھا۔

ہر پیغمبر کو "معجزے" اُس کے عہد کے تقاضے اور ماحول کی مناسبت سے ہی عطا ہوتے ہیں تاکہ اُن کے اوّلین مخاطب اُس پیغمبر کا صحیح اندازہ کرسکیں، مثلاً حضرتِ عیسیٰ سے پہلے حضرت موسیٰ اور حضرتِ عیسیٰ کے بعد حضرتِ محمد علیہم السّلام مبعوث ہوئے۔ حضرتِ موسیٰ کا عہد اور ماحول سحر اور جادو کا تھا اسی لئے حضرتِ موسیٰ نے مُردہ عصا کو زندہ اژدہا اور سادہ کفِ دست کو منوّر پارۂ گوشت بنا دینے کا معجزہ پیش کیا تھا۔ آنحضرت کا ماحول اور مرکز وہ تھا جہاں شعر و ادب درجۂ کمال پر تھا لہٰذا آپ نے قرآن کو بطور معجزہ پیش کیا تھا:۔

وَ اِذَا لَمۡ تَاۡتِہِمۡ بِاٰیَۃٍ	"اور جب تم کوئی معجزہ اُن کے سامنے نہیں
قَالُوۡا لَوۡ لَا اجۡتَبَیۡتَہَا ؕ قُلۡ	پیش کرتے تو لوگ کہتے ہیں کہ تم معجزہ کیوں
اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ	نہ لائے؟ تم کہہ دو کہ میں تو اُس کی پیروی
مِنۡ رَّبِّیۡ ۚ ہٰذَا بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّکُمۡ	کرتا ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے

وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (اعراف ۲۴۔ ۲۰۳) — وحی کیا گیا ہو۔ یہی بصائر ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ایمان لانے والوں کے لئے ہدایت و رحمت ۔

ظاہر ہے کہ اہلِ مصر کسی ادبی کتاب سے متاثر و قائل نہیں ہو سکتے تھے کہ حضرت موسیٰ قرآن پیش کرتے۔ نہ اہلِ عرب سحر اور جادو کو خاطر میں لاتے کہ آنحضرت عصا اور یدِ بیضا پیش کرتے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ نے جو کچھ معجزات پیش کئے وہ اپنے عہد اور ماحول کے تقاضے کے مطابق حذاقت و طبابت سے متعلق پیش کئے تھے چونکہ یہ بنی اسرائیل کے سب سے آخری پیغمبر تھے اور بنی اسرائیل نے بہ نسبت دوسری قوموں کے انکارِ نبوت و معجزات اور اعراضِ رسالت و ہدایت کی حد کر دی تھی۔

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ۝ (بقرہ ۱۱۔ ۸۷) — "جب کبھی کوئی رسول تمہارے پاس آیا اور ایسے احکام لایا جن کو تمہارا دل گوارا نہ کرتا تھا تو تم نے سرکشی اختیار کی۔ بعضوں کو تو تم نے جھوٹا قرار دیا اور بعضوں کو قتل ہی کر ڈالا۔"

لہٰذا اس آخری موقع پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی حد کر دی گئی تھی کہ پیغمبر کا مبعوث ہو کر معجزات دکھانا کیا کہ اُس پیغمبر کی ولادت و پیدائش ہی معجزانہ بنا دی گئی کہ شاید وہ علم و بصیرت اور عقل و فکر کی روشنی میں ہدایت و سعادت حاصل کریں اور پھر آگے بڑھ کر اِس طریقِ پیدائش کو ساری دُنیا والوں کے لئے ایک نشانی، نمونہ اور سبق بنا دینے کی خاطر قرآن میں بھی درج کر دیا گیا

بنی اسرائیل کا یہ فرقہ یا یہود نے تو باوجود علم و مشاہدہ حسبِ عادت اِس طریقِ ولادت پر ایمان نہ لائے اور انھوں نے مریم پر بہتان دھر کر تکذیب

کا نیا انداز اختیار کیا۔ نہ لعبثت کے بعد حضرت عیسیٰ کے طبی معجزات ہی سے وہ متاثر و قائل ہوئے لیکن حیرت تو یہ ہے کہ قرآن والوں نے بھی اِس موضوع فکر و تلاش سے اعراض کیا۔ مسلمانوں کی بے عملی اور جدو کوشش سے بیزاری اِس حد تک پہنچ گئی کہ اگرچہ نظری حیثیت سے مریم کی نبوت اور عیسیٰ کی ولادت کے مسئلے، مسلمانوں کے درمیان لفظی بحث کا موضوع ہمیشہ بنے رہے مگر علمی اور عملی اعتبار سے اُنھوں نے کبھی بھی اس مسئلے کو عنوانِ فکر نہ بنایا۔ وہ یا تو محض اِس کے قائل رہے کہ یہ سب ایک معجزانہ فعل تھا جس کو فکر و عمل سے کوئی تعلّق نہیں یا پھر اُنھوں نے تمام قرآنی آیات کی تاویل کر کے اطمینان کرلیا کہ حضرتِ عیسیٰ بغیر باپ کے ہرگز پیدا نہیں ہوئے تھے۔ یورپ اور امریکہ نے اِس واقعہ سے سبق ضرور لیا۔ مگر اُنھوں نے راستہ ہی غلط اختیار کیا جس سے بنی نوع انسان کو فائدہ کے بجائے نقصان پہنچ رہا ہے اخلاق وجذبات کا خون ہو رہا ہے۔

امریکہ، یورپ اور ایشیا ہر جگہ جانوروں اور انسانوں میں آلات کے ذریعہ پیدائش و افزائشِ نسل کا رواج عام ہو رہا ہے۔ جانوروں کے سلسلے میں تو ہندوستان میں بھی یہ طریقہ تمام حیوانی اسپتالوں میں عام طور سے رائج ہے البتہ انسانوں کے سلسلے میں یہ چیز ہنوز یورپ و امریکہ تک ہی محدود ہے یا پھر جاپان کو اِس کا شوق ہوا ہے۔

یورپ و امریکہ میں وہ عورتیں، جن کے شوہر کسی داخلی و خارجی نقص و مجبوری سے اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے یا کھو چکے ہوتے ہیں یا جن عورتوں کے بچے پیدا ہوتے تو ہیں مگر باپوں کے کسی نقص کے سبب زندہ نہیں رہ پاتے، آلات کے ذریعہ صاحب اولاد بن رہی

ہیں۔ وہاں اس چیز کو تبنّیٰ اور لے پالک سے بہتر سمجھا جاتا ہے اس لئے کہ اگرچہ وہ اولاد اُن کے شوہروں کے نطفہ سے نہیں ہوتی مگر خود اُن کے گوشت پوست کی تو پیداوار ہوتی ہے، جس کی وجہ سے اُن کی "ماتا" کی پوری پوری تسکین کرتی ہے نیز وہاں یہ طریقِ پیدائش اُن عورتوں کے شوہروں کی رضا سے اختیار کیا جاتا ہے۔

اِس کا طریقہ یہ ہے کہ "ماں" بننے کی خواہشمند عورت اِس کام کیلئے کسی خاص ڈاکٹر کو منتخب کرتی ہے کیونکہ یہ کام یا یہ خدمت قانوناً ہر ڈاکٹر نہیں کر سکتا۔ اِس کے لئے یہ لازمی شرط ہے کہ وہ ڈاکٹر شادی شدہ ہی نہیں بلکہ کم سے کم دو بچوں کا باپ بھی ضرور ہو۔ جب عورت ایسے ڈاکٹر کے پاس مع اپنے شوہر کے یا تنہا یہ خواہش لے کر پہنچتی ہے تو ڈاکٹر صاحب سب سے پہلے شوہر کی مرضی معلوم کرتا ہے اور جب اُس کی مرضی پاتا ہے تو عورت کی جانچ کرتا ہے۔ وہ بیضوں کی پیداوار اور حیض کا وقت اور اُس کی مدت معلوم کرتا ہے اور پھر یہ دیکھتا ہے کہ کس دن قیامِ حمل ممکن ہے؟ یہ ایک طرف ہوتا ہے دوسری طرف شوہر کے مادۂ منویہ کی بھی وہ جانچ کرتا ہے اور اگر اُسکا مادہ تخلیقِ اولاد کے ناقابل ٹھہرتا ہے تو وہ ڈاکٹر کسی وجیہہ، تندرست، شادی شدہ صاحبِ اولاد اور علمی، عقلی، دماغی اور جسمانی حیثیت سے بہتر اور ممتاز کسی معطی مرد کا اپنے طور پر انتخاب کرتا ہے اور پھر اُس کی جانچ کرتا ہے کیونکہ اگر معطی مرد کسی سبب سے ناقص ہوا تو پھر کامیابی ناممکن ہے۔ بعض عورتوں کے شوہر سے بچے پیدا ہوتے ہیں مگر زندہ نہیں رہتے۔ وجہ یہ ہے کہ منفی (Rh) رکھنے والی عورت کی شادی مثبت (Rh) رکھنے والے مرد کے ساتھ ہو گئی ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر اِس کی بھی جانچ کرتا ہے کہ معطی مرد اور خواہشمند عورت

دونوں ایک ہی (R ملا) کے حامل ہوں۔ اس تمام جانچ پڑتال کے بعد وہ کوئی خاص دن مقرر کر کے، اُس دن معطی مرد کا مادّۂ منویہ حاصل کر کے ایک گھنٹہ کے اندر اندر پچکاری کے ذریعہ خواہشمند عورت کے رحم میں داخل کر دیتا ہے۔ اِس عمل کے بعد آدھ گھنٹہ وہ عورت خاموش و پُرسکون لیٹی رہتی ہے۔ عام طور سے یہ عمل پہلی ہی بار کامیاب ہو جاتا ہے اور عورت حاملہ ہو جاتی ہے مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو تین بار یہ عمل دُہرانا پڑتا ہے اور خاص خاص حالت میں تو مسلسل چند ماہ بھی لگ جاتے ہیں۔

پہلے مرد کا انتخاب خود عورت کرتی تھی یا ڈاکٹر اُس عورت کی مرضی اور اُس کے علم سے مرد کا انتخاب کرتا تھا مگر بعد میں اِس واقفیت کے ناخوشگوار اثرات کو محسوس کر کے یہ طریقہ چھوڑ دیا گیا۔ اب ڈاکٹر اِس بارے میں انتہائی راز داری سے کام لیتے ہیں۔ معطی مرد اور معمول عورت کو ایک دوسرے کی خبر اور جان پہچان نہیں ہونے دی جاتی۔ نہ ایک کو دوسرے کا نام بتایا جاتا ہے اور نہ ایک دوسرے کو جاننے پہچاننے کا کوئی موقع دیا جاتا ہے۔ دونوں مرد اور عورت کو الگ الگ اقرار نامہ بھی لکھنا پڑتا ہے جس میں تحریر ہوتا ہے کہ وہ اِس راز کو کبھی کسی پر ظاہر نہ کریں گے۔ یہ معاہدے ڈاکٹر کے پاس پوشیدہ طور سے محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ خود ڈاکٹر بھی حلف لیتا ہے کہ وہ دونوں معطی مرد اور معمول عورت میں سے کسی کی شخصیت، دوسرے پہ کبھی ظاہر نہ کرے گا اور ڈاکٹر کی ہدایت ہوتی ہے کہ جتنے معطی مردوں اور معمول عورتوں کے اقرار نامے اُس کے پاس سر بہ مُہر لفافوں میں بند ہوتے ہیں، اُس کے مرنے پر وہ سب بجنسہٖ بند کے بند تلف کر دئیے جائیں اور کسی کو خبر نہ ہو تاکہ معمول عورت کی توجہ نہ ہو اور اُس کی اہلی زندگی میں کوئی بدنظمی

نہ پیدا ہو۔

اگر جانچ سے خواہشمند عورت کے شوہر کے مادّہ منویہ میں بظاہر کوئی خاص نقص نہیں پایا جاتا تو بعض اوقات معطی مرد کے مادّہ منویہ میں خواہشمند عورت کے شوہر کا مادّہ منویہ ملا کے رحم نسوانی میں داخل کیا جاتا ہے تاکہ عورت یہ سمجھے کہ حمل اُس کے خاوند کے مادّہ سے ہی قرار پایا ہے۔ یہ علم کہ اس مادّہ میں کسی اور مرد کا بھی مادّہ شامل تھا، صرف ڈاکٹر تک محدود رہتا ہے۔ آئیوا اسٹیٹ یونیورسٹی کے ایک سائنسداں نے یہ بھی تجربہ کیا ہے کہ بعض مرد کے مادّہ منویہ میں حیاتی جراثیم بہت کم مقدار میں ہو گئے ہیں جس وجہ سے استقرارِ حمل نہیں ہوتا۔ نیز اس نے تجربہ سے معلوم کیا کہ مادّہ منویہ کے جراثیم اگر محفوظ طریقے سے رکھے جائیں تو بہت برسوں تک نہیں مرتے، لہٰذا ایک ترکیب یہ بھی کی جاتی ہے کہ جن عورتوں کے شوہروں کے مادّے میں یہ عیب پایا جاتا ہے، اُس کے مادّے کو چند بار لیا جاتا اور اکٹھا کر کے مناسب وقت پر عورت کے رحم میں داخل کر دیا جاتا ہے اور استقرارِ حمل ہو جاتا ہے چنانچہ اس ڈاکٹر نے تجربے کے دوران تین عورتوں پر اس کا تجربہ کیا اور وہ سو فیصدی کامیاب رہا۔

۱۹۵۲ء کے اگست میں یہ اطلاع اخباروں میں چھپی تھی کہ جاپان کے سارے شفاخانے، بے اولاد جوڑوں کے روزانہ بڑھتے ہوئے تقاضوں کی وجہ سے ایسے معطی مردوں کی باضابطہ فہرست ترتیب دے رہے ہیں جو وجیہ، صاحبِ علم اور ہر حیثیت سے ممتاز ہوں۔ وہاں کے موقر اخبار "سن یوکاں" نے لکھا تھا کہ یہ فہرست ایسے لوگوں کے ناموں پر مشتمل ہو گی جو، ہر اعتبار سے جاپان کے "مکمل مرد" کہلانے کے مستحق ہوں گے۔ جاپان

مشرقی اخلاق کا نمونہ تھا مگر غالبا یہ چیز وہاں امریکی اقتدار کی برکتوں کے ساتھ آئی۔

یورپ اور امریکہ کے "پادری" یعنی مذہبی طبقے کے لوگ اس طریق پیدائش کو مذہبی حیثیت سے غلط قرار دیتے ہیں۔ کنٹربیری کے اسقف اعظم ڈاکٹر جافرے فشر نے ایک دن، ایک جگہ اپنے لکچر میں اس طریق پیدائش پر اظہار رائے کرتے ہوئے کہا کہ "میں اس کو حرامکاری تصور کرتا ہوں" مگر شام کو اسی نے چرچ میں جو تقریر کی، اس میں اس نے اس امر پر بہت زور دیا کہ حضرت مسیح، روح القدس کی برکت کے سبب کنواری مریم کے بطن سے پیدا ہوئے تھے اور یہودیوں کا یہ الزام غلط ہے کہ پاک مریم حرامکاری کی مرتکب ہوئی تھی۔ مگر فشر یہ فرق نہ بتا سکا کہ یہ کیوں ناجائز ہے؟ اور وہ کیونکر درست تھا؟

محترم حضرت علامہ حفظ الرحمن سیوہاروی نے اپنی کتاب "قصص القرآن" جلد چہارم میں، اگرچہ حضرت عیسی کی بغیر باپ کی پیدائش کو مانا ہے اور وہی کچھ فرمایا ہے جو اس سے پہلے کہا گیا ہے یعنی یہ کہ یہ ایک معجزانہ پیدائش تھی مگر صفحہ ۸۵ پر فرمایا ہے کہ:-

"جہاں تک اس مسئلے کا عقلی پہلو ہے، سو عقل اس کے امکان کو ممنوع اور محال قرار نہیں دیتی بلکہ اس کو ممکن الوقوع تسلیم کرتی ہے۔ کیا سائنس کی موجودہ دنیا سے آشنا حضرات اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ آج جبکہ سائنس کی جدید تحقیق نے نظریوں سے آگے قدم بڑھا کر مشاہدہ اور تجربہ سے یہ ثابت کر دیا کہ دوسرے حیوانات کی طرح انسان کی خلقت و پیدائش بھی بیضہ سے ہوتی

ہے اور اُس کو اصطلاح میں خلیۂ تخم (CELL) کہتے ہیں۔ یہ خلیہ مرد اور عورت دونوں میں ہوتا ہے اور حمل قرار پانے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مرد کے خلیاتِ تخم، عورت کے بیضہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہی خلیہ، زندگی اور حیات کا تخم ہے اور قدرتِ حق نے اس کو بہت باریک جُثّہ عطا فرمایا ہے (اس کا قطر انچ کا ۱/[illegible] ہوتا ہے) تو اس تحقیق نے امریکہ اور انگلینڈ کے سائنسدانوں کو اس جانب متوجہ کر دیا ہے کہ کیوں وہ ایک ایسی کوشش کیوں نہ کریں کہ بغیر مرد کی مقاربت کے، جنس رجال کے خلیاتِ تخم کو آلات کے ذریعہ جنس اناث کے بیض میں داخل کر کے وجود انسانی حاصل کرنے میں کامیاب ہوں؟ سائنسدانوں کا یہ تخیل ابھی عملی حیثیت سے کتنا ہی دور ہو لیکن اس سے یہ نتیجہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ عقل اس کو ممکن سمجھتی ہے کہ انسانی پیدائش، آنکھوں دیکھے عام طریقِ ولادت کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی پیدا ہو سکتی ہے اور ان کو قانونِ قدرت کیخلاف اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ ہم نے قدرت کے تمام قوانین کا احاطہ نہیں کر لیا ہے۔ بلکہ انسان جس قدر علم و دانش کی جانب بڑھتا جاتا ہے اُس کے سامنے قدرتِ حق کے قانون کے نئے نئے گوشے کھلتے جاتے ہیں"

علامہ موصوف نے امریکہ اور انگلینڈ کی کوشش کی مثال پیش کر کے آلات کے ذریعہ استقرارِ حمل کو عقلاً تسلیم کر لیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا

؎ علامہ موصوف کی یہ تحریر ۱۹۴۹ء والے ایڈیشن سے پیش کی جارہی ہے اور ۱۹۶۹ء میں ہزاروں ہزار عورتیں آلات کے ذریعہ بچے پیدا کر چکی تھیں۔

مروّجہ طریقے پر حضرتِ عیسیٰؑ کی پیدائش بھی ہوئی تھی؟ آج تو یہ ہوتا ہے کہ کسی غیر متعارف اور لا علوم مرد کا مادۂ منویہ لے کر عورت کے رحم میں داخل کر دیا جاتا ہے جس سے استقرارِ حمل ہو جاتا ہے، کیا پناہ بخدا، یہی کچھ حضرتِ مریمؑ کے ساتھ بھی ہوا تھا؟ محض یہ مان لینے سے کہ عقل اسے ممکن الوقوع تسلیم کرتی ہے، بات ختم نہیں ہو جاتی اور حضرتِ عیسیٰؑ کی پیدائش کی گتھی حل نہیں ہو جاتی اور اتنا کہنا قرآن، عقل اور عصمت کسی کو بھی نفع نہیں پہنچاتا۔

قرآن نے "زنا" سے روکا ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ کیا زنا کا مطلب حقیقتاً ایک جنس رجال اور ایک جنسِ اُناث کے جسموں کا محض ایکدوسرے سے مس ہونا ہے؟ اگر ایسا ہو تو باپ بیٹی، ماں بیٹا، بہن بھائی کے جسموں کا ایک دوسرے سے مس "زنا" ہو جائے گا؟ ٹرین اور بس میں بہت سی جگہوں پر عورتوں اور مردوں کے جسم ایک دوسرے سے ہمیشہ مس ہوتے رہتے ہیں۔ کیا یہی "زنا" ہے؟ قرآن نے حیض کی حالت میں بیویوں سے الگ رہنے کا حکم دیا ہے :-

وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ "اُن سے قربت نہ کرو جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جائیں؟"
(بقرہ ۲۸ - ۲۲۲/۲)

تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اِس حالت میں میاں بیوی کے جسم بھی ایک دوسرے سے مس نہ ہونے چاہئیں اور اگر ہوں تو اس پر "قربت" کا اطلاق ہو گا؟ "روزہ" کے سلسلے میں ہے کہ :-

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ "روزہ کی راتوں میں تمہارے لئے اپنی عورتوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا ہے۔"
(بقرہ ۲۳ - ۱۸۷/۲)

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ دن کے وقت دونوں کے جسم ایک دوسرے سے مس بھی نہیں ہو سکتے اور اگر ہوں تو وہ "مباشرت" کے ضمن میں آئے گا؟ دراصل ان ممانعتوں کا تعلق بدن کے مس سے نہیں بلکہ جنسی وظیفہ اور جنسی فعل سے ہے خود حضرتِ مریم نے جو "بیٹا" ہونے کے سلسلے میں یہ فرمایا تھا کہ:۔

لَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ "مجھے تو کسی مرد نے مس نہیں کیا ہے"!

کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ واقعی کسی بھی مرد کا جسم کبھی اُن کے جسم سے مس نہ ہوا تھا؟ یا یہ مطلب تھا کہ کسی مرد نے اُن سے جنسی تعلق قائم نہیں کیا تھا؟ امریکہ اور یورپ کے پادری یا مذہبی لوگ اگر اس طریقہ سے استقرارِ حمل کو جائز نہیں قرار دیتے اور حرامکاری سمجھتے یا زنا پر محمول کرتے ہیں تو وہ ہرگز بر سرِ غلط نہیں۔ ایک مرد کا مادۂ منویہ کسی غیر عورت کے جسم میں، چاہے جس ذریعہ سے بھی پہنچے یا پہنچایا جائے، اُس کے "زنا" اور اس وجہ سے "حرام" ہونے میں کیا شبہ کیا جا سکتا ہے؟ کوئی عورت، کسی غیر مرد سے ہمبستر ہو کر حاملہ ہو یا اُس مرد کا مادۂ منویہ اُس عورت کے رحم میں پچکاری سے داخل کیا جائے اور وہ حاملہ ہو جائے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

یہ بات ہرگز قابلِ تسلیم نہیں کہ حضرتِ مسیح کی پیدائش جو آئندہ ساری دنیاؤں والوں کے لئے ایک نمونہ نشانی اور سبق بنائی گئی، یہی تھی جو اِس وقت یورپ اور امریکہ میں رائج ہے۔ یعنی کسی مرد کا مادۂ منویہ لے کر عورت کے رحم میں داخل کر دیا اور وہ حاملہ ہو گئی۔ کیونکہ قرآن نے اِس امر کو نہایت خوبصورت طریقہ سے واضح طور پر اور پوری شدت و طاقت سے واضح کیا ہے کہ جو شے رحمِ مریم میں داخل کی گئی تھی وہ کسی مرد کا ناپاک مادۂ منویہ نہ تھا۔ ہاں البتہ اِس میں کوئی کلام نہیں کہ نوعیت اسی

طرح کی تھی یعنی استقرارِ حمل کے لئے کوئی شے، خارج سے، حضرتِ مریم کے رحم میں داخل کی گئی تھی جس سے استقرارِ حمل ہوا تھا اور اسی لئے خدا کے اُس فرستادہ کو جو مریم کو بیٹا دینے گیا تھا، تنہائی اور بے پردگی کی حالت میں اور انسانی پیکر اختیار کر کے حضرتِ مریم کے روبرو حاضر ہونے کی ضرورت پڑی تھی۔ کیونکہ اُسے ظاہری اور عملی طور پر خارج سے کوئی شے رحم مریم میں داخل کرنی تھی تاکہ وہ بار آور ہو جائیں اور یہ اُن کے سامنے جائے بغیر ممکن نہ تھا۔ ورنہ بشارتِ پسر والے فرشتے بھی مریم کے سامنے گئے تھے مگر وہ انسانی پیکر اختیار کر کے حاضر نہ ہوئے اور سامنے نہ گئے تھے۔ اُنھوں نے صرف آواز دے کر پیغام پہنچا دیا تھا اور خبر سُنا دی تھی۔ مگر اس مرتبہ فرستادہُ الٰہی، انسانی پیکر اختیار کر کے سامنے گیا۔ یہ آیت نہایت اہم ہے:۔

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِن رُّوحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهِ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِينَ

(تحریم ۲- ۶۶/۱۲)

یہ آیت پہلے بھی پیش ہوئی ہے مگر ضرورت ہے کہ اِس کو دوبارہ غور کے ساتھ ملاحظہ فرمایئے۔ اِس آیت کے کئی ٹکڑے ہیں:۔

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا — "اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرمگاہ محفوظ رکھی تھی"

یعنی مریم بالکل دوشیزہ تھی۔ نہ اُس کا کوئی شوہر تھا۔ نہ وہ حرامکاری کی کبھی مرتکب ہوئی اور نہ ہی وہ فرستادہُ الٰہی، جو اُسے بیٹا دینے گیا تھا، مریم سے ہمبستر ہوا تھا۔ اسکا رحم ہر طرح محفوظ تھا۔

فَنَفَخْنَا فِيهِ مِن رُّوحِنَا — "سو ہم نے اُسمیں اپنی روح میں سے نفخ کر دیا تھا"

یعنی بحالتِ دوشیزگی، میرے فرستادہ نے جو مرد کی شکل میں اُس کے پاس حاضر

ہوا تھا، مریم کے رحم میں، میری مرضی سے، خارج سے ایک شے (میری روح میں سے) داخل کر دی تھی تاکہ مریم حاملہ ہو جائے۔

وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ "اور اُس نے اپنے پروردگار کے قوانین اور طے کئے ہوئے فیصلے کو منظور کیا تھا"

یعنی مریم نے میرے حکم کی تعمیل کی تھی اور جس طرح، ہمارے اُس فرستادہ نے ہمارے قوانین کو، طے کئے ہوئے فیصلے کے مطابق اُس پر (APPLY) کیا تھا، اُس نے اُس کی تصدیق کی تھی یعنی منظور کر کے اُس کو دیا کرنے دیا تھا۔ کسی طرح انکار اور ہمارے حکم سے انحراف نہ کیا تھا، اس لئے کہ:۔

كَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ "وہ تھی ہی اطاعت شعاروں میں سے"

یعنی وہ خدا کی مرضی پر راضی اور حکمِ الہٰی پر عامل تھی اِس لئے اُس نے ہمارے فرستادہ کے عمل پر کسی طرح کا کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

اس سے ظاہر ہے کہ حضرتِ مریم کے ساتھ وہ کچھ نہیں ہوا تھا جو آج امریکہ اور یورپ میں ہوتا ہے۔ یورپ اور امریکہ وغیرہ میں جو مرد سے ملے بغیر عورت کو، آلات کے ذریعہ حمل قرار پاتا ہے وہ دراصل اُن تخلیقی یا حیاتی جراثیم کے ذریعہ ہوتا ہے جو مرد کے مادّہ منویہ میں پائے جاتے ہیں۔ مگر وہاں اُس فرستادۂ الہٰی نے جو شے رحم مریم میں، خارج سے داخل کی تھی، وہ کسی مرد کے مادّہ منویہ والے جراثیم ہرگز نہیں تھے۔

"تو پھر وہ کیا تھے؟"

یہی تو وہ طبی معمہ اور سائنسی راز ہے جسے حل ہونا ہے اور اسی کو جاننے اور حل کرنے کے لئے واقعۂ مریم یا پیدائش عیسیٰ کو دُنیا کے لئے "آیت" یعنی نمونہ، نشانی، سبق اور دلیل بنایا گیا تھا۔ دُنیا کو نہ سہی مگر قرآن کو ماننے والے، اُس کو

منزل من اللہ سمجھنے والے اور اُس کو بے شک و ریب ہادی و رہنما تسلیم کرنے والے مُسلم سائنسدانوں کو تو یہ جاننا، تحقیق کرنا اور معلوم کرنا ضروری ہے کہ مرد کے مادۂ منویہ والے جراثیم کے علاوہ، وہ کون سی شے ہے اور کہاں ہے جسکو رحم نسوانی میں داخل کردیا جائے تو عورت بار آور اور حاملہ ہو سکتی ہے؟

قرآن کو "هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ" فرمایا گیا ہے اور سارے مسلمان زبان سے مانتے اور کہتے بھی ہیں:" ہدایت" کے معنی "رہنمائی" کے ہیں۔ یعنی راستہ دکھانا۔ رہنمائی اور راستہ دکھانے کا کبھی یہ مفہوم نہیں ہو سکتا کہ قرآن صرف مسجد ہی کا راستہ دکھائے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں کی زندگی کے ہر شعبے اور اُن کی حیات کے ہر مسئلے میں رہنمائی کرے وہ مسجد کا بھی راستہ دکھائے، اور رصدگاہوں، معمول خانوں اور تجربہ گاہوں کا بھی پھر کوئی رہنما بھی ساتھ چل کر کسی راہرو کو منزل تک نہیں پہنچاتا بلکہ وہ صرف راستہ بتادیتا ہے۔ اب یہ خود اُس راہرو کا کام ہے کہ بتائے ہوئے راستے پر چل کے، اپنی کوشش سے منزل تک پہنچ جائے قرآن بے شک رہنما ہے اور وہ راستہ بھی بتاتا ہے مگر وہ یہ نہیں کرسکتا کہ سلسلے مراحل خود طے کردے۔ اِس بارۂ خاص میں بھی میرا خیال ہے کہ قرآن ضرور رہنمائی کرتا ہوگا۔ ہمارے مُسلم محققین، سائنسداں اور ریسرچ اسکالرس، اگر اِس موضوع پر غور و فکر اور اِس امر پر تحقیق و تلاش کریں تو انشاء اللہ ضرور کامیاب ہونگے۔

جہاں تک میری فکر اِس طرف جاتی ہے وہ عرض کئے دیتا ہوں، شاید کچھ مدد ملے۔ برہم ہوئے بغیر، سنجیدگی سے سنیئے اور سوچیئے۔

قرآن نے فرمایا ہے کہ حضرتِ مسیح عیسیٰ ابن مریم کی پیدائش یوں ہوئی کہ مریم جب پردہ کی جگہ پر تنہا ہوئیں تو:۔

فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا ؕ سو ہم نے بھیجا اُس کے پاس اپنے

(مریم ۲۱۔ ۱۷/۱۹) روح کو"

فَنَفَخْنَا فِیْهَا مِنْ رُّوْحِنَا "سو ہم نے نفخ کر دیا اس میں اپنی روح

(انبیاء ۱۷۔ ۹۱/۲۱) میں سے"

لفظ "روح" سے ہمارے یہاں عام طور سے "جان" مراد لی گئی ہے، روح کانپ گئی، روح پرواز کر گئی وغیرہ عام طور سے بولا جاتا ہے اسی لئے روح، روحانیات اور عالم ارواح وغیرہ کی اصطلاحیں رائج ہیں۔ مگر مجھے قرآن میں لفظ "روح" بمعنی "جان" یا "جی" کہیں بھی ابھی تک نہیں ملا ہے۔ پیدائش اور وجود اختیار کر لینے کے بعد جتنی جگہ بھی ذات انسانی کا قرآن میں کسی نوع سے بھی ذکر آیا ہے وہاں موقع کے لحاظ سے "جی" اور "جان" کے لئے لفظ "نفس" واحد یا "انفس" (جمع) ہی آیا ہے، مثلاً یہودیوں کے قانون کا ذکر ہوا ہے کہ:۔

وَكَتَبْنَا عَلَیْهِمْ اَنَّ النَّفْسَ "اور ہم نے اُن پر لکھ دیا تھا کہ جان کے

بِالنَّفْسِ (مائدہ ۶۔ ۴۵/۵) بدلے جان"

پیغمبر سے خطاب ہوا ہے کہ:۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰى "سو شاید تم ان کے پیچھے غم سے اپنی

اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا جان دے دو گے اگر یہ لوگ اس حدیث

بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا (کہف ۱۵۔ ۶/۱۸) پر ایمان نہ لادیں؟"

منافقوں کا شہیدوں کے بارے میں کہنا تھا کہ وہ جنگ میں نہ جاتے تو مرتے نہیں، اُن سے کہا گیا کہ اچھا:۔

فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ "تو پھر اپنی جان پر سے موت کو

(آل عمران ۱۷۔ ۱۶۸/۳) ٹال تو دینا"

مسلمانوں سے جہاں بھی جان اور مال کی قربانی طلب کی گئی ہے وہاں ہے کہ:۔

بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ (نساء ۱۳۔ ۹۵، حجرت ۲۔ ۱۵) "اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے"

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی جان کو جنّت سے خرید لیا ہے :-

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ (توبہ ۱۲۔ ۱۱۱) "بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے اُن کی جانوں اور اُن کے مالوں کو اِس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ اُن کو جنّت ملے گی"

ارشاد ہوا ہے اور کئی جگہ ارشاد ہوا ہے :-

(۱) کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ (آلِ عمران ۱۹۔ ۱۸۵، ۳۵، ۵۷) "ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا لازمی ہے"

(۲) وَمَا کَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ کِتٰبًا مُّؤَجَّلًا (آلِ عمران ۱۵۔ ۱۴۵) "اور کوئی بھی جان ایسی نہیں جس کی اللہ کے حکم سے، معیّن قانون کے مطابق موت نہ آئے"

آزمائش یوں ہوتی ہے کہ :-

نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ (بقرہ ۱۹۔ ۱۵۵) "مالوں اور جانوں کی بربادی کے ذریعے"

یہانتک کہ موت کے سلسلے میں بھی "نفس" ہی کو "وفات" دیئے کا ذکر ہوا ہے :-

(۱) وَالْمَلٰٓئِکَۃُ بَاسِطُوْٓا اَیْدِیْھِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَکُمْ (انعام ۱۱۔ ۹۳) "اور ملائکہ ہاتھ بڑھا رہے ہوں کہ نکالو تم لوگ اپنی اپنی جانوں کو"

(۲) اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا (زمر ۵۔ ۴۲) "اللہ ہی وفات دیتا ہے جانوں کو موت کے وقت"

غرض "نفس" سے مراد "جی" اور "جان" ہے۔ "جی" اور "جان" دل کی وہ دھڑکن ہے جسکے

وجود یہ پورا جسمانی ڈھانچہ برقرار و متحرک رہتا یا اُس کے رُک جانے پر پورا قالب بیکار اور غیر متحرک ہو جاتا ہے۔ یہ دل کی دھڑکن ہی ہے جو پورے نظامِ جسمانی کو متحرک اور سارے اعضاء بدن کو بیکار آمادہ اور عامل بنائے رکھتی ہے۔ اسی دھڑکن کی حیثیت "ذات" کی ہے جو انسان سے "میں" کہلواتی ہے۔ کسی جسمِ انسان کا کتنا ہی حصّہ کاٹ دیا جائے، جب تک اُس کے دل کی دھڑکن برقرار ہے وہ انسان اپنے کو "میں" کہے گا اور اُس کی ذات مسلّم ہو گی اور جس وقت یہ دل کی دھڑکن بند ہو جائے گی وہ "میں" نہیں کہہ سکے گا اس کی ذات موجود متصوّر نہ ہو گی، اگرچہ پورا قالب سالم اور موجود ہو گا جس میں دل بھی ہے اور دماغ بھی۔ "نفس" کو وفات دینے کا مطلب اسی دل کی دھڑکن کو روک دینا ہے۔

اس دل کی دھڑکن، یا "میں" یا ذات یا نفس کی حیثیت وحدانی ہے اور اس طور پر وہ ذاتِ خدا کی وحدانیت کی مظہر قرار پاتی ہے۔ اسی لئے انسان کو "نفس واحدہ" سے پیدا کیا ہوا ظاہر کیا گیا ہے:-

(۱) خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ "تم لوگوں کو پیدا کیا نفس واحدہ سے"

(نساء و زمر ۱ - ۴ ، ۳۹)

یہ یوں ہے کہ جب تک "جرثومۂ زندگی" مرد کے "مادۂ منویہ میں رہتا ہے "نفس واحدہ" ہی اُس کا حامل رہتا ہے اور جب وہ جرثومۂ حیات "رحمِ نسوانی" میں منتقل ہو کر قیام کرتا ہے تو اُس وقت بھی "نفس واحدہ" ہی اُس کا حامل ہوتا ہے۔ یہ تیسری آیت ہے جو "نفس واحدہ" کو خطاب کرتی ہے۔ اس پر غور فرمائیے:-

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ۭ قَدْ فَصَّلْنَا

"اور وہی تو ہے جس نے تم کو "نفس واحدہ" سے بنایا یوں کہ ایک جگہ تو تمہارے ٹھہرنے کی ہے اور دوسری سپرد ہونے کی جگہ

الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ۝ (انعام ۱۲۔ ۹۹/۷) — ہم نے سمجھنے والوں کے لئے خوب تفصیل سے اپنی نشانیاں بیان کر دی ہیں"

یہاں سے وہاں تک "نفس واحدہ" خاندان کا خاندان اور قبیلے کا قبیلہ "نفس واحدہ" یہاں تک کہ ساری دُنیا کے لوگ "اُمتہ واحدہ":۔

کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (بقرہ ۲۳، مائدہ ۷، یونس ۲۔ ۲۱۳، ۴۸/۶، ۱۹/۲) — "تمام کے تمام لوگ امت واحدہ"

یہ ہے "خدائے واحد" کی "وحدانیت" کا مظہر کرشمہ۔ اسی لئے "خدائے واحد" نے اپنی نشانیاں "نفس واحدہ" یعنی ذاتِ انسانی میں جلوہ گر بتلائی ہیں:۔

وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (ذٰریت ۱۔ ۲۱/۱) — "اور خود تمہاری جانوں میں، کیا تم کو دکھائی نہیں دیتا"

بھلا انسان کے لئے، خدائے واحد کو ماننے کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت چاہیئے کہ خدائے واحد کی وحدانیت خود اُس کی ذات میں جلوہ گر ہے۔؟

یہ "جی" یا "نفس" یا "جان" یا "دھڑکن" ہے تو "دل" میں، مگر یہ جو ہمیں زندہ رکھے ہوئے ہے۔ اسی انجن کی چال پر جسم کی مشینری چل رہی ہے جس کی وجہ سے "میں" کا وجود ہے، لہذا ہمارے جسم کے سارے تقاضے اور سہارے اسی "جان" یا "نفس" کا فیضان ہیں یہی وجہ ہے کہ اس سلسلے میں بھی ہر جگہ "نفس" ہی کا ذکر ہوا ہے۔ مثلاً:۔

(۱) بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ (البقرہ ۱۱۔ ۸۷/۲) — "جن کو تم لوگوں کا جی نہیں چاہتا تھا"

(۲) وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيْغًا (نساء ۹۔ ۶۳/۲) — "ان سے اس طرح کہو کہ اُن کے جی میں بات اُتر جائے"

(۳) مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ (یونس ۲- ۱۵/۱۱)
"مجھے یہ اختیار حاصل نہیں کہ میں اُسے اپنے جی سے بدل دوں۔"

(۴) اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ (روم ۱- ۸/۲۱)
"کیا انھوں نے اپنے جی میں غور نہیں کیا۔"

(۵) وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ (حم سجدہ ۴- ۳۱/۲۴)
"اور تمہارے لئے اُن میں وہ سب ہوگا، جس کو تمہارا جی چاہے گا۔"

(۶) وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ (زخرف ۷- ۷۱/۲۵)
"اور اُن میں وہ ہے جو تمہارا جی چاہے اور تمہاری آنکھوں کو اچھا لگے۔"

(۷) يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (حشر ۱- ۹/۲۸)
"مقدم سمجھتے ہیں دوسروں کو اپنی جانوں پر اگرچہ وہ خود ضرورتمند ہی کیوں نہ ہوں اور جو شخص جی کے لالچ سے بچا رہا تو سمجھو کہ وہی لوگ فلاح پانے والوں میں سے ہیں۔"

(۸) وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (حشر ۳- ۱۸/۲۸)
"ہر آدمی جی میں سوچے کہ اُس نے کل کے لئے کیا بھیجا ہے۔"

دل کی مختلف حالتوں اور کیفیتوں کو بھی "نفس" سے ہی تعبیر کیا گیا ہے:-

(۱) نفس امّارہ:- وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ - (یوسف ۷- ۵۳/۱۳)
"اور میں اپنے جی کو بُری الذمہ نہیں بتلاتی کیونکہ بھکانے والا جی تو بُری ہی بات سکھلاتا پڑتا ہو مگر یہ کہ میرا پروردگار ہی رحم کرے، اور برائیوں سے بچائے رکھے۔"

(۲) نفس لوّامہ:- وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ
"اور قسم کھاتا ہوں ایسے جی کی جو اپنے اوپر ملامت کرے"

(۳) نفسِ مطمئنہ :- يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً (فجر ۱- ۲۸۳۰)
"اے اطمینان پا جانے والی جان! اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرکہ تو اُس سے راضی ہو اور وہ تجھ سے راضی ہوا"

احیاءِ موتیٰ کے سلسلے میں حضرتِ ابراہیم علیہ السّلام نے فرمایا تھا کہ :-
وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي - (بقرہ ۲۶۰-۳۵)
"بلکہ میں پوچھتا ہوں اپنے جی کے اطمینان کے لئے"

لفظ "اطمینان" دونوں جگہ ہے جو خود ایک "کیفیت" کا نام ہے۔ سورہ فجر والی آیت کا تعلق "آخرت" سے ہے۔ چونکہ وہاں "موت کا اندیشہ و اضطراب" نہ ہوگا اس لئے "نفس مطمئن" کہا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ والی آیت جو حضرت ابراہیم کے سلسلے کی ہے "دُنیا" سے متعلق ہے اور احیاء موتیٰ کے سوال سے تعلق رکھتی ہے اس میں "اضطرابی کیفیت" کا ہی اظہار تھا اس لئے "اطمینانِ قلب" کا لفظ لایا گیا "حسرت" کا بھی تعلق قلب ہی سے ہے :-

لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَٰلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ (آل عمران ۱- ۱۵۶)
"یہ اس لئے کہ اللہ اُن کے قلوب میں حسرت پیدا کر دے"

"نفاق" کا بھی تعلق قلب ہی سے ہے :-
فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِمْ (توبہ ۱۰- ۷۷)
"سو ڈال دیا نفاق اُن کے قلوب میں"

"اطمینان" کا تعلق تو "قلب" سے ہے ہی :-
لِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ (انفال ۱- ۱۰)
"تاکہ تمہارے قلوب اس سے اطمینان حاصل کریں"

"شک" کا تعلق بھی "قلب" ہی سے ہے:۔

وَارْتَابَتْ قُلُوبُهُمْ فَهُمْ فِي رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُونَ (توبہ۔ ۴۵)	"ان کے قلوب شک میں پڑے ہیں سو وہ اپنے شک میں ڈانواڈول ہو رہے ہیں"

"سمجھ" کا تعلق بھی "قلب" ہی سے ہے:۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا (اعراف ۲۲۔ ۱۷۹)	"ان کے قلوب ہیں مگر وہ کچھ سمجھتے نہیں"

اسی طرح بہت سی کیفیات کو "قلب" سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اطمینان و تسکین کا تعلق "نفس" سے ہے اور "نفس" کا مقام "دماغ" نہیں بلکہ "دل" اور "قلب" ہے

انسان بہت سے اعضاء کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے دو عضو نہایت اہم ہیں ایک "دل" یا "قلب" جس کو (HEART) کہا جاتا ہے۔ "قلب" کے معنی "الٹا ہوا یا اوندھا" کے ہیں۔ اسی سے انقلاب ہے جس کے معنی اوپر کا نیچے اور نیچے کا اوپر ہو جاتا ہے "دل" کو "قلب" اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ سینے میں الٹا لٹکا ہوا ہوتا ہے۔ یہ "دل" ہر وقت دھڑکتا رہتا ہے اور اسی کی دھڑکن پر حیات اور زندگی کا انحصار ہے۔ دوسرا اہم عضو "دماغ" ہے جو ایک انتہائی پیچیدہ ملفوف مغز ہے اور کھوپڑی کے سنگین حصار میں بند ہے۔ ان دونوں دل و دماغ کا ایک دوسرے سے بڑا گہرا اور پھر ان دونوں کا سارے اعضاء جسمانی سے خاصا تعلق ہے۔ مگر یہ تعلق یعنی یہ کہ وہ ایک دوسرے پر کیوں۔ کیا اور کیسے اثر انداز ہیں، ایک سربستہ راز ہے اور اگرچہ اس کو سمجھنے کے لئے کئی علوم بروئے کار آئے مثلاً علم الحیات (BIOLOGY) یا علم النفس (PSYCHOLOGY) وغیرہ، اور بلاشبہ ان کے ذریعہ انسان کی کئی باطنی توانائیوں کا علم بھی حاصل ہوا۔ مگر ہنوز مبداء زندگی اور ماہیت حیات کا علم انسان کو

حاصل :- ہوسکتا کیونکہ جسم انسانی میں وہ چیز جس کو" جان" کہتے ہیں یا جو اپنے کو" میں" کہتی ہے لاینحل ہے۔ قرآن نے" ذات انسانی" یا" حیات وزندگی" یا" قوائے جسمانی" یا" کیفیات انسانی" کے اظہار کے لئے صرف ایک لفظ" نفس" استعمال کیا ہے

دراصل" نفس" یا" جی" کے مختلف" قویٰ" ہیں اور قویٰ کے اختلاف کی بنا پر جب کسی" کیفیت" کو ظاہر کیا جاتا ہے تو الفاظ مختلف آتے ہیں ورنہ ہے یہ سب" جی" یا" نفس" ہی کا کرشمہ۔ مثلاً بہادری کی کیفیت کا اظہار مقصود ہو تو ہم کہیں گے کہ فلاں شیر دل ہے۔ کمزوری کی کیفیت کا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں فلاں بزدل ہے۔ یہ" جی" اور" نفس" کی دو مختلف کیفیتوں کے اظہار کے لئے دو لفظ آ گئے۔

یونانی طریق علاج کے ماہرین جس چیز کو" طبیعت" یا" کیفیت" کہتے ہیں، دراصل وہ بھی" جی" اور" نفس" ہی کے ایک قویٰ کا نام ہے۔ افلاطون نے" طبیعت" کو سمجھاتے ہوئے کہا ہے کہ :-

" طبیعت وہ قوت الٰہی ہے جو مصالح بدن پر موکل ہے"

بقراط نے تعریف یہ کی ہے کہ :-

" طبیعت اس قوت کو کہتے ہیں جو جسم انسانی میں بلا ارادہ و شعور حرکت و سکون کا مبداء ہے"

" ڈاکٹروں کی اصطلاح میں بھی (HUMAN NATURE) جس کو کہا جاتا ہے وہ" طبیعت انسانیہ" ہی ہے۔ اسی لئے وہ بھی مانتے ہیں کہ امراض کو دور کرنے کے لئے جسم انسانی میں خود ایک" قویٰ" ہے لہٰذا علاج کا مطلب دراصل اسی قوت یا طبیعت کی امداد و اعانت ہے۔ غرض جسم انسانی میں سب کچھ" نفس" کا کرشمہ ہے جس کو ہم نے" دل کی دھڑکن" سے تعبیر کیا ہے یا" جی" کہا ہے

شاید آپ کو الجھن ہو رہی ہو کہ ذکر تو شروع ہوا تھا" روح" کا مگر بات

"نفس" پر جا پڑی۔ مگر آپ خود واقف ہوں گے کہ یہ بحث بہت اہم تھی اور شاید نئی اور حیرت خیز بھی۔ دراصل، مجھے یہ بحث اس لئے کرنی پڑی کہ ہمارے یہاں جو "روح" سے "جان" مراد لی جاتی ہے، اس کا قرآن میں مجھے کہیں کوئی ذکر یا پتہ ابتک نہیں ملا ہے۔ قرآن میں "جان" اور "جی" کی تمام کیفیات کو "نفس" کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ "روح" کا لفظ اس بارے میں مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام مٹی کی شکلیں بناتے تھے جو پرندے کی ہوتی تھیں اور انھیں جاندار بنا دیتے تھے مگر ان کی بھی جانداری کے سلسلے میں "نفخ" کا تو لفظ آیا ہے مگر "روح" کا نہیں :-

(۱) أَنِّي أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ
(آل عمران ۵۔ ۴۹)

"میں تم لوگوں کے لئے ایسی شکلیں مٹی کی بناتا ہوں جیسے پرندہ، پھر اس میں پھونک دیتا ہوں تو وہ خدا کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔"

(۲) وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي
(مائدہ ۱۵۔ ۱۱۰)

"اور اے عیسیٰ! جب تم میرے حکم سے مٹی سے پرندہ کی شکل بناتے تھے اور انہیں پھونک دیتے تھے تو وہ میرے حکم سے اڑنے لگتا تھا۔"

اگر "روح" بمعنی "جان" یا "جی" قرآن میں آیا ہوتا تو یہاں یہ ضرور ہی آتا جب کہ "نفخ" کا لفظ بھی آچکا تھا اور پرندوں کی جانداری کا بھی ذکر تھا مگر یہاں بھی لفظ "روح" بمعنی "جان" نہیں آیا اور قرآن میں کہیں بھی نہیں آیا ہے، چاہے وہ حیات کا مسئلہ ہو یا موت کا معاملہ۔ یہاں تک کہ مرنے کے ذکر میں بھی "روح" کے نکلنے یا نکالے جانے کا کہیں ذکر نہیں۔ جان "روح" کو نہیں بلکہ نفس

کو کہا جاتا ہے، اِس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ہم لوگ عرفِ عام میں "تزکیۂ نفس" ہی بولتے ہیں "تزکیۂ روح" نہیں۔ حالانکہ اگر 'جان' سے مراد "روح" ہو تو ہمیں "تزکیۂ روح" کہنا چاہیئے۔ مگر ایسا کوئی نہیں کہتا۔ لہذا "روح" سے مراد "جان" لینا کسی طرح بھی درست نہیں کیونکہ قرآن نے کبھی اور کہیں بھی "روح" کا لفظ "جان" یا ذاتِ انسانی" کے لئے استعمال ہی نہیں کیا ہے۔ بہرکیف، اب آیئے اصل موضوع کی طرف۔

میں نے "روح" کا ذکر یوں شروع کیا تھا کہ سورۂ مریم کی آیت میں "روح" کے مریم کے پاس جانے کا ذکر ہے اور سورۂ انبیا کی آیت میں مریم کے رحم میں "نفخِ روح" کا بیان ہے۔ آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ جہاں "روح" کے مریم کے پاس جانے کا ذکر ہے وہاں اُن کے رحم میں "نفخِ روح" کا بیان نہیں اور جہاں رحمِ مریم میں "نفخِ روح" کا بیان ہے وہاں "روح" کے مریم کے پاس جانے کا ذکر نہیں یہ پہلو اس لئے بچایا ہوا ہے کہ دونوں مقامات کے لفظِ "روح" کے فرق کو سمجھا جائے بلکہ یوں کہیئے کہ دونوں کو مختلف چیز سمجھا جا سکے۔

اب آیئے! سب سے پہلے فاعل روح پر غور کیا جائے کیونکہ یہ جاننا ضروری ہے کہ حضرتِ مریم کے پاس انسان کا پیکر اختیار کر کے کون گیا اور ظاہر ہوا تھا؟ اِس کے بعد سوچا جائے گا کہ اُس فرستادۂ الہیٰ نے کیا چیز مریم کے رحم میں داخل کی تھی جس کو "روح" کہا گیا؟

ہمارے یہاں "روح" سے مَلک یعنی فرشتہ بھی مُراد لیا جاتا ہے جس سے مُراد ایک بالکل خاص قسم کی غیرمرئی آسمانی مخلوق ہے۔ اوّل تو خود لفظ "ملائکہ" قرآن میں مختلف معنوں میں آیا ہے۔ دوسرے قرآن نے ہر جگہ "روح" اور "ملائکہ" کو الگ الگ کر کے بیان کیا ہے۔ مثلاً:-

(۱) تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ (معارج ۱۔ ۴/۲۹) "چڑھتے ہیں اُس کی طرف ملائکہ اور روح"

(۲) يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا (النبأ ۲۔ ۳۸/۳۰) "جس دن صف باندھے کھڑے ہوں گے روح اور ملائکہ"

(۳) تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا (قدر ۱۔ ۴/۳۰) "اُس میں نازل ہوتے ہیں ملائکہ اور روح"

اِن مقامات پر "ملائکہ" اور "روح" کو الگ الگ کر کے بیان کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "روح" اور "ملائکہ" ایک نہیں بلکہ دو شے ہیں اور "ملائکہ" سے "روح" جدا کوئی اور چیز ہے۔ ایک جگہ "ملائکہ" کا ذکر یوں ہے :۔

وَّ اٰبَّةٍ وَّ الْمَلٰٓئِكَةُ (نحل ۷۔ ۴۹/۱۴) "جان رکھنے والے اور ملائکہ"

ظاہر ہے کہ "دابہ" سے مراد "ملائکہ" کے سوا اور مخلوق ہے۔ یا ایک جگہ ہے۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ (آل عمران ۲۔ ۱۸/۳) "اور ملائکہ اور علم والے"

یقیناً یہ دو الگ الگ مخلوق مراد ہیں۔ بالکل اسی طرح "روح" اور "ملائکہ" کو جب جدا جدا کر دیا گیا تو وہ ایک نہیں بلکہ "ملائکہ" اور مخلوق ہیں اور "روح" کوئی اور مخلوق ہے۔ تیسرے بعض جگہ "ملائکہ" کو "روح" کے ساتھ بھیجنے کا ذکر کیا گیا ہے مثلاً۔

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ (نحل ۱۔ ۲/۱۴) "وہی نازل کرتا ہے ملائکہ کو، روح کے ساتھ اُس کے امر میں سے"

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ "ملائکہ" دوسری مخلوق ہے اور "روح" اُس کے

" امر" میں سے ایک " امر" ہے۔ متقدمین نے حضرت مریم کے پاس، بیٹا دینے کو جانے والے " روح " کو ایک مخصوص فرشتہ " جبرئیل " بتایا ہے۔ یہ ایک حد تک درست ہے۔ قرآن کے نزول کے سلسلے میں فرمایا گیا ہے کہ :-

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ	" پوچھو کہ کون ہے وہ جو اس لئے جبرئیل سے
نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ	عداوت رکھے کہ اس نے اس قرآن کو اللہ کے
(بقرہ ۲-۹۷)	حکم سے تمہارے قلب پر نازل کیا ؟"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کو جبرئیل نے قلب رسولؐ پر نازل کیا۔ ان ہی جبرئیل کو دوسری جگہ " روح القدس " اور " روح الامین " بھی کہا گیا ہے :-

(۱) قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ	" کہہ دو کہ اس قرآن کو تو تمہارے پروردگار کی
مِن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (نحل ۱۶-۱۰۲)	طرف سے روح القدس نے نازل کیا ہے "
(۲) وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ	" اور یہ تو رب العلمین کا نازل کیا ہوا ہے
نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ	اس کو روح الامین لے کر اترا ہو تمہارے
عَلَىٰ قَلْبِكَ (شعرا ۲۶-۱۹۲-۱۹۴)	قلب پر "

اس سے ظاہر ہے کہ سورۂ بقرہ میں جس فرستادۂ الہیٰ کو " جبرئیل " کہا گیا ہے اسی کو سورۂ نحل میں " روح القدس " اور سورۂ شعراء میں " روح الامین " کہا گیا ہے۔ مگر " جبرئیل " کو " فرشتہ " نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اُسے " ملائکہ " سے الگ کر کے بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ کی جس آیت میں قرآن لانے کے جرم میں " جبرئیل " سے کافروں کی نفرت و عداوت کا ذکر ہے۔ اس آیت کے بعد ہی دوسری آیت یہ ہے :-

---

سلہ یہ " امر " کتاب اللہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب اور کائنات دونوں میں آیات ہونے کا ذکر اور دونوں میں غور و فکر کرنے کا حکم ہے۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ۝
(البقرہ ۱۲ - ۹۸)

جو شخص اللہ کا اور اس کے ملائکہ کا اور اس کے رسولوں کا اور جبرئیل اور میکائیل کا دشمن ہو تو ایسے کافروں کا اللہ دشمن ہے۔

اس آیت سے بالکل صاف ظاہر ہے کہ "جبرئیل" اور "میکائیل" درحقیقت فرشتوں میں سے نہیں۔ اگر وہ بھی "ملائکہ" میں سے ہوتے تو اللہ اور رسول کی طرح دونوں کو "ملائکہ" سے الگ کرنے کی ضرورت ہرگز نہ تھی بلکہ اللہ، رسول اور ملائکہ کہا جاتا اور "ملائکہ" میں جبرئیل بھی شامل ہوتے مگر ان دونوں کو الگ الگ بیان کرنے سے ظاہر ہے کہ "جبرئیل" الگ ہے "ملائکہ" سے اور وہ کوئی اور چیز ہے اس لئے اللہ، رسول، ملائکہ، جبرئیل چاروں جدا جدا ذاتوں کی چار مخالفت دشمنی کا الگ الگ ذکر کیا گیا۔ سورۃ تحریم میں بھی "جبرئیل" اور "ملائکہ" کا الگ الگ ذکر ہوا ہے۔ ازواج رسول میں سے کسی بی بی کے کسی معاملہ کا ذکر کرتے ہوئے رسول اللہ کے بارے میں ازواج مطہرات سے کہا گیا ہے:-

وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ (تحریم ۱ - ۴)

"اور اگر پیغمبر کے معاملے میں تم دونوں کارروائیاں کرتی رہیں تو سمجھ رکھو کہ اس پیغمبر کا حامی اللہ ہے اور جبرئیل بھی اور صالح مومنین بھی اور ان کے علاوہ ملائکہ بھی اس کے مددگار ہیں۔"

اس آیت نے قطعی طور پر واضح کر دیا ہے کہ "جبرئیل" ہرگز "ملائکہ" میں سے نہیں کیونکہ اللہ، جبرئیل اور صالح مومنین کی مددگاری کے ذکر کے بعد کہا گیا کہ ان کے علاوہ "ملائکہ" بھی اس پیغمبر کے مددگار ہیں۔ لہذا یہ قطعی ہے کہ "جبرئیل" فرشتوں

میں سے نہیں۔

اِسی سورہ کے آخر میں، رحم مریم میں نفخِ روح کا ذکر ہے اور اُس پھونکنے والے کا ذکر سورۂ مریم میں ہے جس میں اُس کو "روح" کہا گیا ہے۔ اور سورۂ بقرہ اور سورۂ مائدہ میں مریم و عیسیٰ پر روح القدس کا احسان دھرا گیا ہے اور قرآن لانے والے کو بھی "روح القدس" کہا گیا ہے۔ لہٰذا اس سے صاف طور پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ حضرت مریم کے پاس، مرد کی شکل میں جو "روح"، پھونکنے گیا تھا وہ "ملائکہ" میں سے کوئی نہیں تھا بلکہ وہ "جبرئیلؑ" تھا قرآن میں کسی جگہ بھی "روح" کا لفظ "فرشتہ" (ملائکہ) کے معنی میں اُسی طرح نہیں آیا ہے جس طرح کہیں پر بھی "روح" کا لفظ "جان" کے معنی میں نہیں آیا ہے۔

اب آیئے یہ دیکھا جائے کہ "جبرئیل" نے مریم کے رحم میں جو چیز نفخ کی تھی وہ کیا تھی؟ قرآن نے فرمایا ہے کہ وہ چیز "روح" تھی۔ سوال یہ ہے کہ "روح" کیا چیز ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہ سوال نزولِ قرآن کے وقت کیا جا چکا تھا اور اللہ کی طرف سے جو کچھ جواب ملا تھا وہ خود قرآن میں موجود ہے:-

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل ۱۰۔ ۸۵)	"لوگ پوچھتے ہیں کہ روح کیا ہے؟ اُن سے کہو کہ روح امرِ رب میں سے ہے۔ اور تم لوگوں کو اس کا علم دیا گیا ہے۔ مگر تھوڑا ہی۔"

جہاں تک کہ ذاتِ الٰہی کا تعلق ہے وہ "اللہ" بھی ہے اور "رب" بھی:—

هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ (کہف ۵۔ ۳۸)	"میرا رب تو وہی ہے جو اللہ ہے"

مگر جب "روح" کے بارے میں پوچھا گیا تو "مِنْ اَمْرِ اللہ" نہیں فرمایا گیا حالانکہ قرآن میں "مِنْ اَمْرِ اللہ" بھی آیا ہے اور متعدد جگہ آیا ہے :-

(۱) مِنْ اَمْرِ اللہ (ہود ۲-۳ - سوا) "اللہ تعالیٰ کے حکم سے"

(۲) مِنْ اَمْرِ اللہ (رعد ۲-۳) "اللہ تعالیٰ کے حکم سے"

بلکہ فرمایا یہ گیا کہ وہ :-

مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (۸۵) "میرے پروردگار کے امر میں سے ہے"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "روح" کو "امرِ ربّ" بلا سبب نہیں کہا گیا بلکہ جتانا یہ مقصود ہے کہ "امر" میں وہ ذرائع و وسائط بھی شامل ہیں جو محتاج ربوبیت یعنی نشو و نما و پرداخت کے حاجت مند ہیں۔ دوسرے لفظوں میں روح کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ "امرِ ربّ" میں سے ایک "امر" ہے۔ اب غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ "امر" سے کیا مراد ہے؟

"امر" کے معنی "حکم" کے بھی ہیں اور "کام" کے بھی۔ اوامر اور "امور" اسکی جمع ہے۔ یعنی "امر" کام بھی ہے اور "کام کا انجام دینے والا" بھی۔ مطلب یہ نکلا کہ جو کام انجام پائے وہ بھی "امر" ہے اور جو تمام اسباب و علل کے کاروبار کو انجام دینے والے، ذرائع و وسائط ہیں وہ بھی امر ہیں۔ سورۂ نزعت میں "امر" اور "تدبیر امر" دونوں کی قسم کھائی گئی ہے :-

وَالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا (نزعت ۱- ۳ - ۵) "قسم ہے اُن کی جو تیرتے ہوئے چلتے ہیں - پھر تیزی سے دوڑتے ہیں پھر تدابیر امر کرتے ہیں۔"

یعنی ہر وہ شے "امر" ہے جو قانونِ قدرت سے انجام پائے اور جن ذرائع و وسائط سے انجام پائے۔ اِس جگہ "تدابیر امر" کو ذرائع و وسائط سے متعلق بتایا گیا ہے۔

دوسری جگہ اسی "تدبیرِ امر" کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے متعلق کیا ہے :-

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ (سجدہ ۔ ۳۲/۵)

"وہ ایسا ہے جو آسمانوں سے زمین تک تدابیرِ امر کرتا ہے"

غور فرمائیے۔ پہلی آیت میں "ذرائع و وسائط" کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہ "تدبیرِ امر" کرتے ہیں اور یہاں اپنے بارے میں کہا گیا ہے کہ ہم "تدابیرِ امر" کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "کام" بھی "امر" ہے اور جن "ذرائع و وسائط" سے وہ کام انجام پاتے ہیں وہ بھی "امر" ہیں۔ اس کو یوں سمجھئے کہ درخت میں بھی نر و مادہ ہوتے ہیں۔ یہ نر و مادہ الگ الگ اور غیر متحرک ہوتے ہیں۔ ان کے اتصال کی کوئی ظاہری صورت نہیں ہوتی اور بغیر نر و مادہ کے ملے اور نر درخت سے مادہ حاصل کئے مادہ درخت حاملہ اور بار آور نہیں ہو سکتا۔ سائنسی تحقیق سے ظاہر ہو چکا ہے کہ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ نر درخت کے غبار یا پولن (Pollen) یا نطفۂ منویہ کو ہوا اُڑا کر مادہ درخت تک پہنچا دیتی ہے اور مادہ درخت حاملہ ہو جاتا اور پھول پھل لاتا ہے۔ اس طور پر اس غبار یا مادہ کو بھی "امر" کہا جائے گا ہوا کو بھی "امر" کہا جائے گا اور پہنچانے کے کام کو بھی امر کہا جائے گا۔ اور اسی تفصیل کے اجمال کا نام ہوگا "تدبیرِ امر"۔

اب آئیے روح کی طرف۔ ذرا غور فرمائیے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ قرآن نے جہاں پر "روح" کو کہا گیا ہے وہاں اُس کو "امر اللہ" نہیں کہا بلکہ "امرِ رب" فرمایا ہے۔ "زندگی" اور "حیات" والے کو سامانِ زیست اور اسبابِ نشو و نما پہنچانے والے کو "رب" یعنی "پروردگار" کہا جاتا ہے چاہے وہ اللہ تعالیٰ ہو بڑے پیمانہ پر یا کوئی انسان ہو چھوٹے پیمانے پر۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ جملہ اس مضمون کا بہترین ترجمان ہے۔ زلیخا نے کواڑ بند کر کے ورغلانا چاہا تو وہاں پر حضرت یوسف نے

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ
(یوسف ۱۲ - ۲۳-۲۴)

"کہا کہ خدا کی پناہ! وہ تو تمہارا شوہر میرا رب ہے۔ اُس نے مجھے کتنی اچھی طرح رکھا ہے۔ بےشک ظالموں کو کبھی فلاح ہو سکتی ہے؟ وہ تو اس پر جھک گئی تھی مگر یوسف بھی پھسل پڑتا۔ اگر وہ اپنے رب کی دلیل نہ دیکھتا۔"

اِس آیت میں پہلا "رب" کا لفظ عزیزِ مصر کے لئے آیا ہے اور دوسرا اللہ تعالیٰ کے لئے۔ کیونکہ دونوں ہی یوسفؑ کے مجازی و حقیقی ربوبیت کرنے والے، پرورش پرداخت کرنے والے تھے۔ ساتھ ہی یہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ جہاں پر "رب" کا لفظ عزیزِ مصر کے لئے آیا ہے وہاں پر اللہ تعالیٰ کے لئے "رب" کا نہیں بلکہ اللہ کا لفظ آیا ہے "مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْ"۔ اس سے عیاں ہے کہ "اللہ" اور "رب" میں فرق ہے۔ اللہ تعالیٰ "اللہ" بھی ہے اور "رب" بھی۔ وہ پیدا کرنے والا بھی ہے اور سامانِ زیست بہم پہنچا کر بہترین نشوونمائے حیات بخشنے والا (ربوبیت کرنے والا) مہربان بھی۔ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" "سب تعریف اللہ کے لئے ہے۔" بات پوری ہو گئی تھی مگر "ربّ العٰلمین" کا اضافہ کیا گیا۔ کیوں اللہ تعالیٰ تمام ستائش و نیائش کا مستحق ہے؟ اِس لئے کہ وہ ساری دُنیاؤں والوں کی ربوبیت کرنے والا ہے۔ تمام ذی حیات مخلوق کو بقائے زندگی اور نشوونمائے حیات کے سامان بہم پہنچانے والا ہے۔

"روح" کو "امرِ ربّی" کہا گیا ہے، اِس سے نکتہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "امر" ایسے بھی ہیں جن میں "زندگی" ہے۔ "حیات" ہے۔ "جان" ہے جس وجہ سے وہ "محتاجِ ربوبیت" ہیں۔ زندگی رکھنے کے سبب اُن کی نشوونما ہوتی ہے۔ پرورش و پرداخت کی جاتی ہے نتیجہ یوں نکلا کہ "روح" سے مراد "امر" ہے اور یہ "امر" ایک جامع لفظ ہے جس سے

مراد "جاندار" اور "بے جان" دونوں ہے۔ "وحی" اور "کتاب" کو بھی "امر" کہا گیا ہے:۔

(۱) ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗۤ اِلَيْكُمْ (الطلاق ۱- ۲۸/۵) — "یہ اللہ کا امر ہے کہ اس کو تم لوگوں پر نازل کیا ہے۔"

(۲) جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا۔ (جاثیہ- ۲۵/۱۸) — "ہم نے تم کو اپنے امر میں سے ایک شریعت پر کر دیا سو تم اس پر چلے چلو۔"

بالکل اسی طرح "وحی" اور "کتاب" کو "روح" بھی کہا گیا ہو اور اُسے "امر" میں سے بتایا گیا ہے:۔

(۱) يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ (نحل ۱- ۱۴/۲) — وہ نازل کرتا ہے ملائکہ کو روح کے ساتھ اپنے امر میں سے۔

(۲) يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ (مومن ۲- ۲۴/۱۵) — "وہ اپنے امر میں سے روح کو اپنے جس بندے پر چاہتا ہے القا کرتا ہے۔

(۳) اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (شوریٰ ۵- ۲۵/۵۲) — "ہم نے اپنے امر میں سے روح کو وحی کیا۔

اِن آیات میں "روح" سے مراد "وحی الٰہی" اور "صحیفۂ آسمانی" ہے۔ یہ امر جاندار نہیں۔ اسی لئے اِس کو "امر رب" نہیں کہا گیا لیکن کچھ امر وہ بھی ہیں جو "زندگی" رکھتے ہیں محتاجِ ربوبیت ہیں جیسے "جراثیم"۔ اس لئے اُن کو "امر رب" کہا گیا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ امر سے مراد "ذرائع و وسائط" ہیں۔ اور "امر" ہر جگہ مختلف شکلوں میں موجود ہیں۔ "امر" ہی کے اقسام میں سے وہ بھی ہیں جو فضا میں تیرتے، دوڑتے اور اُڑتے رہتے ہیں اور وہ بھی جو پانی اور مٹی وغیرہ سے لپٹے لپٹائے اور سمٹے سمٹائے رہتے ہیں۔ اِن ہی میں سے کوئی ایک "امر" وہ ہے جس سے تخلیقِ انسانی ہوتی ہو اور جسے موجودہ اصطلاح میں خلیہ (CELL) اور اسپرمٹوزوا (SPERMATOZOA) خواہ جرثومہ (GERM) کہا جاتا ہے۔

ابتداً انسان کی تخلیق و پیدائش اُن خلیات یا جراثیم سے ہوتی تھی جو پانی اور مٹی میں ہیں، اس کے بعد اُن سے ہونے لگی جو مرد کے مادۂ منویہ میں ہیں:-

(۱) هُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا (فرقان ۲۵۔ ۵۴) — "وہ اللہ ایسا ہے جس نے انسان کو پانی سے پیدا کیا ہے"

(۲) لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ" (مومنون ۲۳۔ ۱۲) — "بلاشبہ ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا ہے"

(۳) إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَمْشَاجٍ (دہر ۷۶۔ ۲) — "ہم نے بیشک انسان کو اُبھل کرنے والے نطفہ سے پیدا کیا ہے"

اس سے ظاہر ہے کہ انسان کی تخلیق فی نفسہٖ پانی یا مٹی خواہ نطفہ سے نہیں بلکہ اُن "جراثیم" سے ہوئی یا ہوتی ہے جو ان میں پائے جاتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر انسانی تخلیق والے جراثیم حیات، جو مرد کے مادۂ منویہ میں پائے جاتے ہیں، وہ پانی اور مٹی (خواہ ان دونوں کے مرکب کیچڑ) میں بھی موجود ہیں۔

اگر کوئی عورت مرد سے ہم بستر ہو اور اس مرد کے مادۂ منویہ میں وہ تخلیقی جراثیم موجود یا زندہ یا تندرست یا کارآمد نہ ہوں تو اس عورت کا ہمبستر ہونا نہ ہونا برابر ہے اور عورت کو ہرگز حمل قرار نہیں پا سکتا۔ ورنہ بے مرد سے ملے بھی اگر جراثیم حیات کو عورت کا تندرست رحم مل جائے، چاہے وہ جراثیم حیات کسی طرح بھی رحم نسوانی میں پہنچائے گئے ہوں تو استقرار حمل لازمی ہے۔

نتیجتاً یہ سمجھنا ہرگز صحیح نہیں کہ بچہ کی پیدائش کے لئے مرد و عورت کا ہمبستر ہونا قانونِ قدرت ہے۔ کیونکہ عورت، بچہ پیدا کرنے کے لئے فی نفسہٖ مرد کی محتاج ہے ہی نہیں۔ در اصل وہ اُن جراثیم کی محتاج ہے جو مرد کے مادۂ منویہ میں ہیں۔ "مرد" محض ذریعہ ہے اُن جراثیم کو عورت کے رحم تک پہنچانے کا، اب وہ

جراثیم کوئی مرد، مشتبر ہو کر رحم نسوانی میں پہنچا دے یا پچکاری (SYRINGE) کے ذریعہ، ہر صورت میں حمل قرار پا جائے گا۔ اور قرآن کا فرمانا ہے کہ:۔

فَإِنَّا خَلَقْنَٰكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ (حج ۱- ۲۲) "سو بے شک ہم نے لوگوں کو پہلے مٹی سے پیدا کیا پھر نطفہ سے۔"

یعنی ابتداً انسان کی پیدائش مٹی سے ہوئی، اس کے بعد اُس کا پیدا کیا جانا نطفہ سے ہونے لگا۔ بہ الفاظ دیگر، وہ جراثیم حیات جن سے انسانی تخلیق ہوتی ہے، مٹی اور نطفہ دونوں میں موجود ہیں۔ اب اس صورت میں بات یوں ٹھہری کہ حضرت مریم کے رحم میں جو شے باہر سے داخل کی گئی تھی، وہ شے "روح" تھی اور "روح" دراصل "امر رب" میں سے ایک خاص قسم کا "امر" ہے یعنی وہ روح ایسے ذی حیات ادامر میں سے ہے جو محتاج ربوبیت ہیں۔ نیز وہ جراثیم حیات، اتنے چھوٹے نازک اور مختصر ہیں کہ انفراداً اُن کی تعریف "روح یعنی امر رب" کے سوا دوسرے لفظوں میں عمدہ طریقے پر کی بھی نہیں جا سکتی۔ جہاں پر "روح" کو سمجھایا گیا ہے وہاں پر یہ بھی کہا گیا ہے کہ:۔

وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (بنی اسرائیل ۱۰- ۸۵) "تم لوگوں کو اس کے بارے میں علم نہیں دیا گیا ہے مگر ہاں تھوڑا سا۔"

یعنی کائنات میں ہوا، پانی اور مٹی وغیرہ کے اندر لاتعداد جراثیم یا ارواح موجود ہیں مگر ان میں سے تھوڑے ہی سے کا علم لوگوں کو ہے۔ بابائے سائنس "لوئی پاسچر" سے پہلے حقیقت تو یہ ہے کہ اس بارے میں کسی کو مطلق کوئی علم ہی نہ تھا۔ حالانکہ مسلم سائنسدان قرآن میں تدبر و تفکر فرماتے اور تحقیق و تلاش جاری رکھتے تو یہ سہرا اُن کے سر بندھتا کیوں کہ ان کے پاس بے شک و ریب رہنما قرآن اس موضوع پر رہنمائی کر رہا تھا۔

حاصلِ کلام یہ ہوا کہ درحقیقت جبرئیلؑ نے بشر کا پیکر اختیار کر کے جو شئے حضرت مریمؑ کے رحم میں داخل کی تھی وہ "جرثومۂ حیات" تھا جس سے استقرارِ حمل ہوا تھا اور یہ جرثومۂ خارج میں بھی اسی طرح کہیں موجود ہے جس طرح مرد کے مادۂ منویہ میں۔ چونکہ پہلے انسان کی تخلیق پانی اور مٹی خواہ دونوں کے امتزاج کیچڑ سے ہوئی ہے لہٰذا یہ جراثیمِ حیات، پانی اور مٹی میں ضرور موجود ہیں اور تحقیق و تلاش جاری رہی تو وہ یقیناً ملیں گے اور چونکہ عورت، مرد کی نہیں بلکہ صرف اُن جراثیمِ حیات کی محتاج ہے لہٰذا وہ جراثیم رحمِ نسوانی میں پہنچائے جائیں گے تو قطعی استقرارِ حمل ہوگا اور تندرست و معیاری بچہ پیدا ہوگا اور یہ عین قانونِ قدرت کے مطابق اور قطعی پاک و صاف بچہ ہوگا اور صرف اسی وجہ سے قرآن نے پیدائشِ عیسیٰ کا قصہ قرآن میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کر کے اس واقعہ کو "اٰیَۃً لِّلنَّاسِ" اور "اٰیَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ" ظاہر کیا تھا علامہ اقبالؒ، خدا اُن پر رحمت فرمائے، قرآن کے اسرار کے زبردست واقف کار تھے انھوں نے اس راز کو پا لیا تھا اسی لئے انھوں نے "ماتا" اور مادرانہ "شفقت و محبت" پر سب سے زیادہ زور دیا" ازدواجی زندگی" کی خوبیوں پر زور نہیں دیا۔ اس لئے کہ "عورت" کے بچہ مرد کے ذریعہ ہو یا آلات کے ذریعہ اس کی "ماتا" کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا۔ مگر وہ انتہائی محتاط انسان تھے اسلئے اُنھوں نے جاوید نامہ میں اس مسئلے کو "تیرۂ مریخ" سے منسوب کر کے یوں ظاہر فرمایا تھا۔

دختکی یزداں چہ بے چہ آید مرا — لذتِ ایماں بیفزاید مرا
آمد آں وقتے کہ از اعجازِ فن — می تواں دیدن جنین اندر بدن
در بسیطِ ایں عصر، اعصارِ دگر — آشکارا گردد، اسرارِ دگر
پرورش گیرد "جنین" نوعِ دگر — بے شبِ ارحام در یابد سحر

لالہ ہائے داغ و باداں پاک | بے نیاز از شبنمے خیزد ز خاک
خود بخود بیروں فتد اسرارِ زیست | نغمہ بے مضراب بخشد تارِ زیست

یعنی وہ زمانہ دور نہیں جب مرد کی منت پذیری کے بغیر عورت حاملہ ہو کر بچے پیدا کرے گی اور اس کے بعد وہ زمانہ بھی آ سکے رہے گا جب تخلیقِ انسانی کے لئے عورت کی بھی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ یہ اشارہ آدم کی پیدائش کی طرف ہے،

آدم یا سب سے پہلے انسان کی تخلیق کے سلسلے میں یہ جرثومۂ حیات کہاں ڈالا گیا تھا؟ یہ ہنوز نا دریافت مسئلہ ہے اور محتاجِ تفکر، کیوں کہ تخلیق کے سلسلے میں، جرثومۂ حیات کے رحم نسوانی میں ادخال اور استقرارِ حمل کے بعد مولود کی درستگی شروع ہو جاتی ہے:۔

یَآاَیُّھَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ الَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ ۝ (انفطار ۱۔ ۶-۷)	"اے انسان! تجھ کو اپنے کرم گستر پروردگار کے باب میں کس چیز نے دھوکا دیا جس نے تیری تخلیق کی، پھر تجھے درست کیا پھر اعتدالی بنایا۔"

مگر آدم کے سلسلے میں "درستگی" کے بعد "نفخِ روح" کا ذکر ہے:۔

فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ (الحجر ۳۔ ۲۹)	"سو جب میں اُس کو درست کر لوں اور اُس میں اپنی روح میں سے نفخ کر دوں"
(۲) ثُمَّ سَوّٰہُ وَنَفَخَ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِہٖ (سجدہ ۱۔ ۹)	پھر اُس کو درست کیا اور اُس میں اپنی روح میں سے نفخ کر دیا۔"
(۳) فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ (ص ۵۔ ۷۲)	"سو جب میں اُس کو درست کر لوں اور اسمیں اپنی روح میں سے نفخ کر دوں۔"

یہ درستگی، بعد کے اندازِ تخلیق کے برخلاف، یقیناً تخلیق و تصویر سے پہلے کی چیز ہے:۔

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ "اور ہم نے تم لوگوں کو پیدا کیا۔ پھر ہم ہی نے
(اعراف-۲-۱۱) تمہاری صورت بنائی"

ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ آدم کے سلسلے میں، پہلے کہیں کوئی "درستگی" ہوئی پھر اس کے بعد "نفخِ روح" یعنی جرثومۂ حیات کا ادخال ہوا۔ اور تب حسب دستور تخلیق و تصویر کے مدارج طے ہوئے اور یوں آدم پیدا ہوا۔ بہرکیف ایک الگ موضوعِ تحقیق ہے۔ یوں ہی لاطائل بات نہیں۔ ڈاروِن کا نظریۂ ارتقاء علمی اعتبار سے چاہے جس قدر بھی حسین معلوم ہو اور باعثِ قدر افزائی ہو جائے مگر حقیقتاً قرآن کے بیان کردہ مسلّمات سے ہرگز مطابق نہیں ہوتا۔ ضرورت یہ ہے کہ مسلم اہلِ فکر اِس موضوع پر اختلاف و اتفاق کی لاطائل بحث کیلئے نہیں بلکہ اسرار کی نقاب کشائی کے لئے تحقیق کریں کہ یہ بڑا کارنامہ ہوگا۔ بہرکیف! حضرتِ عیسیٰؑ اور مریمؑ کے سلسلے میں، آپ نے یہ ملاحظہ فرمالیا ہوگا کہ دو نوں ماں بیٹے پر اللہ تعالیٰ نے "روح القدس" کا بار بار احسان دھرا ہے۔ در حقیقت لفظ "روح القدس" بڑا جامع اور خوبصورت لفظ استعمال ہوا ہے اور اُسکا احسان دھرنا بھی کئی حیثیتوں سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

اوّل یہ کہ حضرتِ مریمؑ کی دوشیزگی، پاکیزگی اور عصمت مآبی پر "روح القدس" کہہ کر مُہرِ شہادت لگائی گئی ہے تاکہ یہ بخوبی واضح ہو جائے کہ جو فرستادۂ الٰہی بہ شکلِ انسان اور مرد، مریمؑ کے پاس گیا اور جس نے جرثومۂ حیات اُن کے رحم میں داخل کیا تھا، وہ بھی مریمؑ کے ساتھ ملوث نہ ہوا تھا بلکہ مریمؑ جیسی اس واقعہ سے پہلے دوشیزہ تھی ویسی ہی بعد میں بھی رہی کیوں کہ فرستادۂ الٰہی واقعی کوئی بشر نہیں تھا جس پر کسی طرح کا شبہ ہو سکے بلکہ وہ جبرئیل تھا جو "روح القدس" ہے۔ ہر طرح کی گندگی و کثافت سے منزہ اور پاک۔

دوم یہ کہ جس طرح لفظ "روح القدس" حضرت مریم کی عفت و عصمت پر ضمانت پیش کرتا ہے۔ اسی طرح خود اُس فرستادۂ الہٰی کی بھی پاکیزگی و عصمت کا ضامن بنتا ہے۔ یعنی وہ فرستادۂ الہٰی جو بہ شکلِ انسانی مریم کے سامنے ظاہر ہوا تھا وہ خود بھی پاک اور مقدس تھا اور اُس سے کوئی حرکت ایسی سرزد نہیں ہو سکتی تھی، جو پاکیزگی و تقدس کے خلاف ٹھہرائی جائے اس طور پر "روح القدس" عامل اور معمول دونوں ہی کی عصمت و پاکیزگی کا بہترین و مقدس ضامن ٹھہرتا ہے اور یہ لیا اس لئے کیا گیا تاکہ وہ خطرات قطعاً دفع ہو جائیں جو ایسے مواقع پر انسانی قلوب میں پیدا ہو سکتے ہیں اور اس طور پر واضح کیا گیا کہ وہاں استقرارِ حمل کی وہ صورت وقوع پذیر نہیں ہوئی تھی جو نظامِ عالم میں رائج ہے۔ نیز یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کے عملِ نفخِ روح کو "نفخنا" کہہ کے اپنی ذات کی طرف منسوب کیا کہ "ہم نے ایسا کیا تھا" تاکہ کسی طرح کی بھی بدگمانی کا شائبہ تک نہ رہے۔

سوم یہ کہ جو "روح" یعنی "جرثومۂ حیات"، تخلیقِ عیسیٰ کے لئے رحمِ مریم میں داخل کیا گیا تھا وہ کسی مرد کے ناپاک نطفہ یا ناطاہر مادۂ منویہ سے نہیں لیا گیا بلکہ وہ "روح القدس" تھا یعنی پاک جرثومہ تھا جو خارج سے لیا گیا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ ان حیثیتوں سے حضرتِ عیسیٰ یا جناب مریم پر "روح القدس" کا احسان دھرنا نہ صرف بالکل درست ہے بلکہ قرآن کی حسین معجز بیانی کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے۔

حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں ایک چیز اور قابلِ ذکر و گفتگو ہے۔ وہ یہ کہ اس سلسلے میں تین جگہ لفظ "کلمہ" آیا ہے۔ سو اس کا مطلب کیا ہے؟ پہلا مقام وہ ہے جب حضرتِ مریم کو حضرتِ عیسیٰ کی بشارت دی گئی تھی۔ فرمایا گیا تھا:۔

یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكِ "اے مریم! اللہ تعالیٰ تجھے اطلاع دیتا ہے

بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ (آل عمران ۵-۴۵) — اپنے ایک کلمہ کی جس کا نام "مسیح عیسیٰ" ابن "مریم" ہوگا۔

دوسرا مقام وہ ہے جبکہ عیسائیوں کے غلط تصورات و معتقدات کی اصلاح کی گئی ہے

إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَى مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ (نساء ۲۳-۱۷۱) — بیشک مسیح عیسیٰ مریم کا بیٹا، اللہ کا رسول ہے اور اس کا ایک کلمہ ہے جو مریم پر ڈالا گیا تھا اور اس کے روح میں سے ہے۔"

تیسری جگہ حضرتِ مریم کے ذکر میں ہے کہ :۔

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِن رُّوحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهِ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِينَ ۝ (تحریم ۲- ۶۶/۱۲) — "اور عمران کی بیٹی مریم کہ جس نے اپنی شرمگاہ محفوظ رکھی تھی۔ سو ہم نے اپنی روح میں سے پھونک دیا تھا اور اس نے تصدیق کی تھی اپنے پروردگار کے کلمہ اور اس کتاب کی اور وہ تھی ہی اطاعت شعاروں میں سے ہے۔"

یہی وہ تینوں مقامات ہیں جہاں پیدائشِ مسیح کے سلسلے میں "کلمہ" کا لفظ آیا ہے۔ اور ہر جگہ اس سے مراد "اللہ تعالیٰ کی طے کردی ہوئی بات" اور "خدائی فیصلہ" یعنی "قانون" ہے۔ بشارت کے موقع پر کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ تجھے خبر دیتا ہے ایک کلمہ کی اگر اس کا مطلب "بیٹا" لیا جائے، جیسا کہ بعض لوگوں نے فرمایا ہے تو اس صورت میں سورۂ نساء والی آیت کے ٹکڑے "رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ" کے معنی ہو جائیں گے "اللہ کا رسول اور اس کا بیٹا" جو ظاہر ہے کہ بالکل لغو ہے۔ درحقیقت "کلمہ" سے مراد "قانون" ہے۔ یعنی حضرتِ مریم کو بشارت دی گئی کہ اللہ تمھیں اپنے ایک قانون کی اطلاع دیتا ہے جو تم پر ([illegible]) کیا جائے گا اور اس ذریعہ سے جو بچہ ہوگا وہ ابنِ مریم کہلائے گا۔ کیونکہ اس کا کوئی باپ نہ ہوگا۔ میں عرض کر چکا

ہوں کہ عورت کا حمل فی الحقیقت "مرد کا مرہونِ منت نہیں بلکہ صرف "جراثیم حیات" کا کرشمہ ہے۔ مرد تو محض ذریعہ ہے اُن جراثیم کو، جو اُس کے مادّے میں موجود ہیں، عورت کے رحم میں پہنچانے کا۔ قانونِ خداوندی یہ ہے کہ وہ جراثیم عورت کے رحم میں داخل ہو کر استقرارِ حمل کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اِس طور پر عورت کا، مرد سے ہمبستر ہونا "قانونِ تخلیق" نہیں کہ حضرتِ عیسیٰؑ کی بلا باپ کی پیدائش کو قانونِ قدرت کے خلاف کہا جائے بلکہ، تخلیقِ انسانی والے جراثیمِ حیات اور خلیاتِ زندگی کا رحمِ نسوانی میں پہنچنا قانونِ قدرت ہے۔ بشارتِ عیسیٰؑ کے موقع پر اسی قانونِ تخلیق کے نئے طریقے پر (APPLICATION) کی مریم کو اطلاع دی گئی تھی جس کو کلمہ کہا گیا۔ یعنی اُن کو خبر دی گئی تھی اِس بات کی کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ساری دُنیاؤں کی عورتوں میں سے اِس کام کے لئے منتخب کیا ہے کہ وہ اپنے ایک قانون کو تم پر غیر معروف طریقے سے (APPLY) کرے گا جو ساری دُنیاؤں والوں کے لئے ایک نمونہ قرار پائے گا۔ اور اِس طور پر تم کو بن باپ کا جو بچّہ پیدا ہوگا، وہ مسیح عیسیٰ ابنِ مریم کہلائے گا۔ آپ قرآن میں اِس آیت کا موقع نکال کر دیکھیے۔ وہ یوں ہے:-

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ	"اور جب کہ ملائکہ نے کہا تھا کہ اے
اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ	مریم! بے شک اللہ نے تجھ کو چُنا ہے اور
وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ	پاکیزہ قرار دیا ہے اور منتخب کیا ہے ساری
يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ	دنیاؤں کی عورتوں کے مقابلہ میں۔
وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ...	اے مریم! تُو اپنے پروردگار کی اطاعت گذار
اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ	رہ اور رکوع و سجود کیا کر رکوع کرنے والوں
اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ	کے ساتھ ..... جبکہ ملائکہ نے کہا کہ اے

مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۔ (آل عمران ۵۔ ۴۲۔ ۱۴۵) | مریم! اللہ تجھے اطلاع دیتا ہے اپنے ایک قانون کی جو مسیح عیسیٰ ابن مریم کہلائے گا۔

یعنی ملائکہ نے مریم کو اطلاع دی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے پاک صاف بنایا ہے اور تجھے دنیاؤں کی تمام عورتوں میں سے منتخب کیا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ تجھ پر اپنا قانون، نئے انداز میں (APPLY) کرے۔ اور اس کے نتیجے میں تجھے ایک لڑکا ہوگا یوں کہ تخلیقی جراثیم تیرے رحم میں خارج سے داخل کر دیئے جائیں گے اور تو بدستور کنواری اور پاک صاف رہے گی اور اس کے لئے تجھے موجودہ روش زندگی بھی بدلنی یا ختم کرنی نہ پڑے گی لہٰذا تو اس قانون کے (APPLICATION) سے روگردانی نہ کرنا۔ تو جس طرح اور معاملات میں خدا کی اطاعت گذار رہی ہے۔ اسی طرح اس معاملے میں بھی اطاعت شعار رہنا اور اس طور پر جو بچہ ہوگا اس کا کوئی باپ نہ ہوگا لہٰذا وہ تیرے نام سے منسوب ہو کر "مسیح عیسیٰ ابن مریم"۔ کہلائے گا۔

یہ پوری بشارت یا اطلاع ایک بار دی گئی تھی اور حضرت مریم کو، اس عہد کی ساری دنیاؤں کی عورتوں کے مقابلے میں منتخب کرنا صرف اس وجہ سے تھا کہ ان پر تخلیق کے قانونِ خداوندی کو نئے طریقے سے (APPLY) کر کے اس چیز کو ساری دنیاؤں والوں کے لئے ایک سبق اور نشانی بنانا تھا۔ اور دنیا کو بتانا تھا کہ ایک عورت کنواری اور پاکباز رہ کر اور کسی مرد سے ملے بغیر بھی حاملہ ہو سکتی اور ایک تندرست و معیاری بچہ پیدا کر سکتی ہے یوں کہ خارج کے تخلیقی جراثیم کو دریافت کیا جائے اور رحم نسوانی میں داخل کر دیا جائے۔ اس طور پر تخلیق کا قانونِ قدرت تو وہی قائم رہتا ہے یعنی جراثیم کا رحم عورت میں داخل ہو کر تخلیق کا ذریعہ بنتا، البتہ (APPLICATION) کا قاعدہ مختلف ہو جاتا ہے جس طرح قانون

تخلیق پہلے بھی وہی تھا جبکہ انسان پانی یا مٹی والے جراثیم سے پیدا ہوا تھا مگر بعد میں (APPLICATION) کا دستور بدل دیا گیا تھا اور انسان نطفہ والے جراثیم سے پیدا ہونے لگا۔ چونکہ اس قانون کی ایک عملی شکل بطور نمونہ لوگوں کے سامنے لانا ضروری تھا اس لئے مریم کا انتخاب عمل میں آیا تھا۔

دوسری آیت میں عیسائیوں کے اس عقیدہ کی تردید کی گئی ہے کہ عیسیٰ کے بغیر باپ کے پیدا ہونے سے یہ نہ سمجھو کہ مریم خدا کی بیوی ہے یا عیسیٰ کو "روح اللہ" یا "کلمۃ اللہ" کہنے سے یہ نہ خیال کرو کہ وہ خدا کا بیٹا ہے بلکہ خدا سے اس کا تعلق صرف اتنا ہی ہے کہ وہ خدا کا رسول ہے اور ایک ایسے تخلیقی قانونِ قدرت کے طریقِ نو کا مظہر ہے جو مریم پر (APPLY) کیا گیا تھا۔ اِسلئے اُسے "مریم کا بیٹا" کہو۔ اس طور پر یہاں بھی لفظ "کلمہ" بمعنی "قانون" ہی استعمال ہوا ہے۔

تیسری آیت میں حضرت مریم کا ذکر ہے کہ اس نے اپنے پروردگار کے "کلمہ" اور "کتاب" کی تصدیق کی تھی۔ اگرچہ میں اسے پہلے بھی ٹکڑہ ٹکڑہ کرکے سمجھا چکا ہوں مگر پھر مزید تفصیل سے غور کرکے سمجھ لیجئے۔ اس آیت کے چار ٹکڑے ہیں:-

(۱) اَلَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا "جس نے اپنی شرمگاہ محفوظ رکھی تھی"

اس سے یہ ظاہر کرنا اور جتا دینا مقصود ہے کہ نہ تو مریم کا کوئی شوہر تھا نہ وہ بدکار تھی اور نہ وہ فرستادۂ الٰہی (جبرئیل) جو مریم کو بیٹا دینے گیا تھا، مریم سے ہمبستر ہوا تھا بلکہ مریم بدستور کنواری اور باعصمت دوشیزہ تھی کہ اس کو ایک تخلیقی قانونِ قدرت کے نئے طریقے پر (APPLICATION) کے لئے چنا گیا تھا اور جب اس کا مقررہ وقت آگیا تھا تو میرا ایک فرستادہ مریم کے پاس پہنچا تھا اور

بیرا قانونِ تخلیق اس نے اس پر نئے طریقے پر ([illegible]) کیا تھا۔

(۲) فَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُّوحِنَا "سو پھونک دیا ہم نے اس میں اپنی روح میں سے"

یعنی یہ کہ وہ جراثیمِ حیات اور خلیات زندگی جو تخلیقِ انسانی کا ذریعہ بنتے ہیں اور دوسرے ہر قسم کے جراثیم کی طرح خارج میں بھی موجود ہیں اور جن کی حیثیت ہمارے "ذی حیات امر" اور "محتاجِ ربوبیت روح" کی ہے اُن میں سے ایک جزوِ حیات مریم کے رحم میں داخل کر دیا گیا تھا۔

یہاں یہ نہ بھولئے کہ اگرچہ رحمِ مریم میں جبرئیل نے وہ جزوِ حیات داخل کیا تھا یا نفخِ روح کیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی ذات سے فرمائی کہ ہم نے نفخ کیا تھا۔ یہ اس لئے کہ جبرئیل بھی اللہ ہی کا "روح" اور "امر" ہے اور جزوِ حیات بھی اللہ ہی کا "روح" اور "امر" ہے۔ اس کا کچھ کرنا خود اللہ ہی کا کرنا متصور ہے۔ بھلا جب رسول اللہ کے بعض فعل کو خود اللہ تعالیٰ اپنے سے منسوب کرتا ہو۔

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ - (انفال ۲ - ۱۷) "جو کنکریاں تم نے پھینکی تھیں وہ تم نے نہیں پھینکی تھیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں"

تو جبرئیل تو اور بھی منزہِ دستِ قدرت ہے۔ لہٰذا اس کا نفخِ روح یا دخالِ جزوِ حیات کرنا دراصل اللہ کا کرنا تھا۔ اس طور پر یہ طریقِ پیدائش عین اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔

(۳) وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهِ "اور مریم نے اپنے رب کے کلمۂ کتاب کی تصدیق کی"

"کلمہ" سے مراد قانونِ قدرت ہے اور "کتاب" کا مطلب یہ ہے کہ طے کر دیا جاتا ہے کہ وہ قانون مریم پر نافذ کیا جائے گا۔ تخلیقِ انسانی کی یہ نئی طریقِ پیدائش کا عمل مریم پر ہوگا۔ اور اس قانون کو مریم پر ([illegible]) کر کے دنیا والوں کو اس طرف متوجہ کیا جائے گا۔ مسلمانوں پر روزوں کی پابندی لگائی گئی تو کہا گیا کہ۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (بقرہ ۲۳- ۱۸۳) "تم لوگوں کے لئے روزہ رکھنا اُسی طرح طے کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے کے لوگوں کے لئے رکھنا طے کیا گیا تھا"

لہٰذا اس ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ جس قانون کا مریم پر (APPLY) کر کے دُنیا کے لئے نمونہ بنایا جانا طے کر دیا گیا تھا اُس پر مریم نے سر جھکا دیا تھا اور اُسکی تصدیق کر دی تھی۔ یعنی جس طرح میرے فرستادہ نے میرے حکم سے، مریم پر اِس قانون کو (APPLY) کیا، اُس طرح مریم نے کرنے دیا تھا۔ اُس نے اعتراض وانکار یا حجت وتکرار نہیں کی تھی اور جو فیصلہ اللہ تعالیٰ نے اُس کے لئے کیا تھا اُس کو اُس نے بطیب خاطر منظور کر لیا تھا کیونکہ :۔

وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ "وہ تھی ہی اطاعت شعاروں میں سے"

حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرتِ مریم کے ظرفِ عالی اور راضی برضاء الٰہی رہنے کی عجیب وغریب مثال ہے اور یہ مریم ہی کا دل گردہ اور حوصلہ تھا جو وہ اِس نئے طریقِ پیدائش پر راضی ہو گئی تھیں جس کی انفرادیت وعجوبگی کے سبب ہر قسم کی ذلت ورسوائی اور خفت وبدنامی کا صبر آزما اندیشہ متصور تھا۔ بھلا کون کنواری عورت، اِس طرح بچے کی پیدائش پر راضی اور عملِ استقرارِ حمل پر آمادہ ہو سکتی تھی، اگرچہ وہ خدا کے حکم سے کیوں نہ ہو؟

غرض "کلمہ" "بمعنی قانون" اور "فیصل شدہ بات" قرآن میں بہت جگہ آیا ہے۔ مثلاً :۔

(۱) لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (کہف ۴-۲۷) "اُس کے قانون کو کوئی بدل نہیں سکتا"

(۲) تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ (ہود ۱۰-۱۱۹) "تمہارے پروردگار کا قانون تو پورا ہو کر ہی رہے گا۔"

(۳) يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ (اعراف ۲-۱۵۸) "جو کہ ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور اُسکے قوانین پر"

(۴) كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ (مومن ۱۔ ۶) "اس طور پر تمھارے پروردگار کا قانون ثبت ہوگیا"
بالکل اسی طرح متذکرۂ بالا تینوں آیتوں میں سلسلۂ قصۂ عیسیٰ ابنِ مریم لفظ "کلمہ"
بمعنیٰ "قانون" آیا ہے۔

حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں، قرآن کی ہی روشنی میں ایک بات
کہنے کی اور ہے۔ یورپ کی توجہ اِس امر پر ہو گئی ہے کہ "کنواری پیدائش" یعنی
بلا مرد اور کسی خارجی عمل کے عورت کا از خود حاملہ ہونا اور بچہ پیدا کرنا ایک
ممکن الوقوع امر ہے۔ لندن یونیورسٹی کالج میں پیدائشی سائنس کی مشہور لیکچرر
ڈاکٹر ایلن اسپروے کی رائے میں پیدائش کے لئے ہمیشہ یہ ضروری نہیں کہ
مرد موجود ہو۔ انھوں نے برطانیہ کے مؤقر "میڈیکل جرنل لانسٹ" میں کئی مضمون
اس عنوان پر لکھے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ یہ "کنواری پیدائش" کا میڈیکل اصول
سائنس کو عرصہ سے معلوم ہے۔ مثلاً مکڑی[1] بغیر نر کے اپنے بچہ کو پیدا اور پرورش
کر سکتی ہے۔ بعض بعض بلیوں اور دوسری قسم کے جانوروں کے بیضے اس طرح
تقسیم ہوتے ہوئے پائے گئے ہیں جیسے اُن میں نر نے تخم ریزی کی ہو۔ غرض ڈاکٹر
ایلن اسپروے، بغیر مرد اور خارجی عمل کے عورت کے حاملہ ہونے اور بچہ
پیدا کرنے کے امکان کو بڑی شدت کے ساتھ تسلیم کرتی ہیں۔ وہ یہ
بھی کہتی ہیں کہ یہ امکان سولہ لاکھ میں ایک کا ہے۔ نیز اُن کا کہنا ہے کہ ایسے

---

[1] قرآن میں ایک سورۂ عنکبوت (مکڑی) کے نام سے منسوب ہے۔ ممکن ہے کہ مکڑی کی ایسی انوکھی خصوصیت کے سبب، ذہن کو اُس طرف منتقل کرنے کے لئے ایک سورہ اِسی نام سے منسوب کر دی گئی ہو۔ اِس سورہ کی یہ آیات محلِ نظر ہیں:۔

تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ (عنکبوت ۴ ۴۳) "ہم یہ مثالیں لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں اور ان باتوں کو تو بس علم والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔"

بچے کو مشکل ہی سے ایک نیا آدمی کہا جا سکتا ہے کیوں کہ وہ درحقیقت اپنی ماں کا قوام یا دراصل اپنی ماں ہی کا ایک حصّہ ہوتا ہے۔ موصوفہ یہ بھی فرماتی ہیں کہ یہ بچہ ہمیشہ لڑکی ہوتا ہے اور اپنی ماں کے بالکل مماثل یعنی زندگی کے ہر دَور میں یہ بچی بالکل ایسی ہی ہوگی جیسی عمر کے اُس دَور میں اُسکی ماں ہی ہے۔ بہرکیف! یورپ میں "کنواری پیدائش" کا مسئلہ فی زمانہ غور و فکر کا خاص عنوان بنا ہوا ہے مگر اُس کی بنیاد ٹھوس نہیں۔

اِس بارے میں دو چیزیں اہم ہیں۔ اوّل یہ کہ تخلیقِ انسانی کا یہ نظریہ کہ بغیر خارج سے کوئی شے رحمِ نسوانی میں داخل ہوئے بھی، از خود بچے کی پیدائش ممکن ہے، از روئے قرآن قابلِ تسلیم نہیں۔ قرآن سے ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ کوئی عورت یوں بچے پیدا کرے کہ نہ وہ مرد سے ملی ہو نہ طبّی طریقے سے جراثیمِ حیات اُس کے رحم میں داخل کیے گئے ہوں۔ قرآن بغیر عورت کے بچے کی پیدائش کے امکان کو تو پیش کرتا ہے مگر اِس کا سُراغ نہیں ملتا کہ کوئی عورت یوں ہی بچہ جن دے۔ بلاشبہ روایات میں کئی عورتوں کے از خود بچہ جننے کی حکایات موجود ہیں اور یورپ میں فی زمانہ بھی چند عورتوں نے اپنے کو یہ کہہ کر پیش کیا ہے کہ وہ خود بخود حاملہ ہو کر بچی جنی ہیں، مگر اِس اندازِ پیدائش کا قرآن سے کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ لہٰذا نا قابلِ اعتبار ہے۔

دوسری چیز یہ کہ یہ کوئی کلیہ نہیں کہ مرد سے ملے بغیر عورت کے جو بچہ پیدا ہو وہ لڑکی ہی ہو بلکہ قرآن سے اس کے خلاف ثبوت ملتا ہے کہ حضرت مریمؑ بغیر مرد سے ملے حاملہ ہوئیں اور اُنھیں ایک معیاری بچہ پیدا ہوا جو لڑکا تھا۔

جہاں تک لڑکا اور لڑکی کی پیدائش کا سوال ہے۔ قانونِ الٰہی کا

ابھی صرف اتنا ہی پتا چلایا جا سکا ہے کہ بچّے کی جنس والدین کے طرزِ معیشت اور ماں باپ کے اختیار کردہ تمدن پر مبنی ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ جو والدین اتنی محنت کرتے ہیں کہ وہ اپنی غذا سے اپنی طاقت کو بحال رکھ سکیں، اُن کے ہاں لڑکے زیادہ پیدا ہوتے ہیں اور جو لوگ مشقّت کے عادی نہیں ہوتے وہ بالعموم لڑکیاں پیدا کرتے ہیں۔ یہ انداز نہ صرف انسانوں ہی تک محدود ہے بلکہ تقریباً پچاس برس سے علماء اِس نظریہ پر متفق ہیں کہ جب جانور کو کم خوراک ملتی ہے اُس وقت وہ نر بچّے جنتا ہے اور جب اُس کو پیٹ بھر چارہ دیا جاتا ہے تب مادہ بچّے پیدا ہوتے ہیں۔ طبّی تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ مرد کے اندر جو مادۂ منویہ ہوتے ہیں وہ کھاری ہوتے ہیں اور عورت کے مادۂ منویہ ترش ہوتے ہیں۔ یہ فرق اِس وجہ سے ہوتا ہے کہ مرد طبعی طور پر طاقت خرچ کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ اور عورت طبعاً اپنی قوت جمع رکھتی ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ جسم پر جب مشقّت کا بار زیادہ پڑتا ہے تو وہ "غذائی ترشے" کو جلا دیتا ہے اور اُس کو ایسی صورت میں تبدیل کر دیتا ہے جو لڑکے پیدا کرنے کے لئے سازگار ہوتی ہے۔ اِس کے برعکس عورتوں میں بالعموم یہ "غذائی ترشہ" محفوظ رہتا ہے اور وہ لڑکیوں کی پیدائش کا باعث بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصر کے نامور ڈاکٹر نجیب ریاض بھی کہتے ہیں کہ حسبِ منشاء بچّے پیدا کرنے کے لئے والدین کو اپنے طرزِ معیشت اور ماحول پر نظر رکھنی چاہیئے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بغیر باپ کی پیدائش کے سلسلے میں قرآن سے جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں، میں نے صفحاتِ گذشتہ میں تفصیل کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ میں اپنے مافی الضمیر کو زیادہ سے

زیادہ صاف طریقے پر، عام فہم زبان اور ملائم انداز میں آپ کے سامنے پیش کر دوں ، اور اگر پوری بات آپ کے سامنے نہ آ سکے تو ایک خاکہ ضرور سامنے آ جائے، تاکہ لوگوں کو، غور و فکر اور تلاش و جستجو کی ایک راہ ملے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی سمجھ کا مختصر طور پر یہاں ذکر کر دوں۔ میں نے جو کچھ، قرآن کی روشنی میں سمجھا ہے یہ ہے کہ:۔

(۱) حضرتِ عیسیٰ قطعی طور پر بلا باپ کے پیدا ہوئے۔

(۲) حضرتِ مریم کا نہ تو کسی مرد سے کبھی بھی نکاح ہوا۔ نہ انھوں نے بناہ بخدا بدکاری کی۔ اور نہ سوائے حضرتِ عیسیٰ کے اُن کو کبھی اور کوئی اولاد ہوئی۔

(۳) حضرتِ مریم کبھی بھی نہ تو ہیکلِ یہود میں داخل ہوئیں نہ راہبہ یا تن کبھی بنیں اور نہ ہیکلِ یہود میں کوئی عورت بحیثیت مجاور یا نن لی جاتی تھی۔ نہ ہی ہیکل والوں کے لئے ازدواجی اور اہلی زندگی ممنوع اور ناجائز تھی۔

(۴) قومِ مریم نے، حضرت مریم پر حرامکاری کا ہی بہتان دھرا تھا۔ چونکہ اُن کا کسی سے نکاح نہ ہوا تھا اور لوگوں نے اُن کی گود میں مولود عیسیٰ کو دیکھا، فرض کر لیا کہ یہ مریم کی بدکاری کا نتیجہ ہے۔

(۵) حضرتِ عیسیٰ کی پیدائش یوں ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو بھیجا جو مرد کی شکل اختیار کر کے مریم کے سامنے اُس وقت ظاہر ہوئے جبکہ وہ بحالتِ برہنگی اپنی ضرورت سے خلوت میں تھیں۔ اِس کے بعد جبرئیل نے جرثومۂ حیات کو اُن کے رحم میں داخل کر دیا جس سے استقرارِ حمل ہو گیا

(۶) یہ تخلیقی جرثومۂ حیات کسی مرد کے ناپاک مادۂ منویہ سے نہیں لیا گیا تھا، بلکہ جراثیمِ حیات خارج میں بھی، بہ قرینۂ غالب مٹی، پانی یا کیچڑ میں موجود ہیں۔

(۷) اِس نوع کی پیدائش، قانونِ قدرت کے خلاف نہیں بلکہ عین قانونِ قدرت کے مطابق ہے۔ اس لئے کہ استقرارِ حمل کیلئے قانونِ قدرت عورت و مرد کا باہم ملنا اور ہمبستر ہونا نہیں بلکہ تخلیقی جراثیم کا عورت کے رحم میں پہنچنا ہے۔ یہ جراثیم حیات، مرد ہمبستر ہو کر پہنچائے یا پچکاری سے رحم نسوانی میں پہنچایا جائے۔ استقرارِ حمل ہو جائے گا۔

(۸) یہ طریقِ پیدائش ناجائز نہیں ہوگی بلکہ قطعی جائز ہوگی۔ اور مولود اپنی ماں سے منسوب ہوگا۔ یہی وجہ ہے جو ہمارے یہاں یہ مشہور رہی کہ قیامت کے دن ہر شخص "ماں" سے منسوب ہو کر پکارا جائے گا۔

(۹) یورپ کا موجودہ طریقِ پیدائش، کہ کسی غیر مرد کا مادّہ منویہ لے کر کسی عورت کے رحم میں پہنچا کے، استقرارِ حمل کرایا جائے۔ قطعی طور پر حرامکاری اور منشائے خداوندی اور قانونِ اخلاق کے منافی ہے۔

(۱۰) قرآن میں "روح" کا لفظ بمعنی "جان" کسی جگہ بھی اب تک میری نظر سے نہیں گذرا بلکہ "جان" کے لئے ہر جگہ "نفس" کا لفظ آیا ہے۔

(۱۱) "روح" سے مراد "امر" ہے چاہے وہ مرئی ہو یا غیر مرئی۔ کتاب ہو یا ذرائع و وسائط۔

(۱۲) حضرتِ عیسیٰ کی پیدائش کو ساری دنیاؤں والوں کے لئے ایک نمونہ اور نشانی بنایا گیا ہے اور نشانی یا نمونہ یعنی "آیت" اُسی کو کہا جاتا ہے جس سے سبق لیا جائے اور فائدہ اُٹھایا جائے۔ طبیّ تحقیقات اور سائنسی ریسرچ نے اب تک اِس جرثومہ کو خارج میں دریافت نہیں کیا ہو لہذا ضرورت ہے کہ مسلم سائنسداں، قرآن کی رہنمائی کی بنا پر، جس میں کوئی شک و ریب نہیں، اِس عنوان پر تدبر و تفکر اور تلاش تجسّس فرمائیں۔

قرآن کے علاوہ کوئی بھی تحریر یہ مرتبہ اور عزت نہیں رکھتی کہ اُس میں کلام نہ کیا جائے۔ لہذا میری یہ خواہش ہے کہ میری تحریر پر آپ بے چون وچرا ایمان لے آئیں اور نہ آپ کے لئے یہ زیبا ہے کہ کسی بات کو، محض اس لئے مان لیں کہ میں کہہ رہا ہوں یا کوئی بھی ایسا کہہ رہا ہے۔ اس موضوع کا عقیدہ وایمان سے بھی کوئی سروکار نہیں۔ یہ ایک خالص علمی وفکری مسئلہ ہے اس لئے آپ تدبر وتفکر اور تسلیم وانکار کے پورے طور پر مجاز ہیں۔

حضرت علامہ غلام احمد صاحب پرویز دورِ حاضر کے ایک ممتاز قرآن فہم اور قابل قدر صاحبِ فکر وبصیرت فرد ہیں۔ اور اگرچہ اس بارے میں اُن کی رائے، میرے مندرجہ بالا خیالات سے مختلف ہے مگر اُنھوں نے اپنی مؤقر تصنیف "معارف القرآن" جلد نمبر ۲ صفحہ نمبر ۱۴۹ میں نہایت ہی معقول بات یہ تحریر فرمائی ہے کہ:-

"قرآن کریم نے جن مقامات پر ولادتِ حضرت عیسیٰ کا ذکر کیا ہے انہیں غور سے دیکھئے اور جس نتیجے پر وہ مقامات پہنچا دیں اُنھیں صحیح سمجھئے یہ ہو سکتا ہے کہ بعض مقامات کے یقینی مفہوم متعین کرنے میں ابھی زمانہ کی علمی سطح کے اور بلند ہونے کا انتظار کرنا پڑے تا آنکہ تاریخی انکشافات واثری تحقیقات ان متشابہ آیات کو محکمات میں بدل دیں ہم انھیں بہرحال اپنے زمانہ کی علمی سطح کے مطابق ہی سمجھ سکتے ہیں۔"

لہذا آپ کا فرض ہے کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اپنے طور پر بھی قرآن میں غور وفکر فرمائیں۔ اس میں تو شک ہی نہیں کہ موجودہ تحقیقی علم وعمل اُس مرتبے پر نہیں پہنچا ہے جس مرتبہ پر اُس کو قرآن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں پیش کرتا ہے۔ ابھی علم کو یہ پتہ چلانا ہے کہ وہ جراثیم حیات مٹی اور پانی یا کیچڑ میں

ہیں یا نہیں اور؟ اور "عمل" کو یہ ثابت کرنا ہے کہ ان جراثیمِ حیات کو رحمِ نسوانی میں پہنچا کے
استقرارِ حمل کرایا جا سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں چیزیں محض تلاوتِ قرآن
سے نہیں بلکہ تحقیق و تدقیق اور فکر و عمل، سے حاصل ہوں گی۔ قرآن صرف "راہنما"
ہے وہ "ڈاکٹر" نہیں۔ وہ محض اشارے کرتا ہے تفصیل نہیں دے سکتا۔ (ایک
بھائی نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا۔ پھر پریشان ہونے لگا کہ لاش کو کیا کرے؟

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا یَّبْحَثُ فِی	"تو اللہ تعالیٰ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کو کریدتا
الْاَرْضِ لِیُرِیَهٗ كَیْفَ یُوَارِیْ	تھا تاکہ وہ اس کو دکھائے کہ کس طرح وہ اپنے
سَوْءَةَ اَخِیْهِ (مائدہ - ۳۱)	بھائی کی لاش کو زمین میں دفن کر دے"

ظاہر ہے کہ قدرت کی طرف سے کوّے نے آکر اس کو اشارہ کر دیا تھا اور اس کے بعد وہ اُڑ گیا تھا، اُس نے تجہیز و تکفین کے مراحل ادا نہیں کئے تھے۔

آخر میں، ایک اور بات کا ذکر کئے بغیر میں، اس سلسلے کو ختم کرنا نہیں چاہتا۔ حضرتِ مریم کے بے شوہر، روح القدس کے ذریعہ حاملہ ہونے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بے باپ کے پیدا ہونے کو قرآن میں "اٰیَةً لِّلنَّاسِ" (بنی نوعِ انسان کے لئے نمونہ اور نشانی) بنایا اور ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس پیدائش کے مسئلہ کو، عنوانِ فکر اور موضوعِ تلاش بنا کر دنیا والے اس سے سبق حاصل کریں۔ اب اگر تحقیق و تلاش سے وہ جراثیمِ حیات دریافت ہو گئے جو عورت کے رحم میں پہنچنے پر تخلیقِ اولاد کر سکیں تو عورت محتاجِ مرد نہ رہے گی اور محض اولاد کے لئے اُس کو کسی مرد سے شادی کرنے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ بلکہ وہ بدستور دوشیزہ یا کنواری رہ کر بھی "ماں" بن سکے گی۔ پھر اگر ایسا ہوا تو کیا یہ چیز "بنی نوعِ انسان" کے لئے مفید ہوگی؟ یا مضر؟ ایک صاحب نے ایک موقع پر اس مسئلے کو "لادینی" سے تعبیر کر کے فرمایا ہے:-

"لادینی مذہب کا منطقی نتیجہ اِس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ عورتیں اپنی فطرت کے خلاف زندگی بسر کرنے پر مائل ہو جائیں جس کا نتیجہ معاشرہ کی تباہی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ غور کیجئے اگر عورتیں تجرد کی زندگی بسر کرنا شروع کر دیں تو اِس کا نتیجہ بدکاری، زناکاری، عیاشی، قتل خون، فتنہ و فساد، اخلاقی بربادی اور روحانی تباہی کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے"۔

اِس کا مطلب یہ ہوا کہ :-

(۱) اگر ایسا ہو تو نتیجہ بدکاری، بداخلاقی بربادی اور روحانی تباہی کی صورت میں نکلے گا۔

(۲) یہ چیز بنی نوع انسان کے لئے زحمت ہو جائے گی۔

جہاں تک کہ پہلی شق کا تعلق ہے، سوچنے کی چیز یہ ہے کہ قرآن نے حضرت مریم اور حضرت عیسٰی دونوں کو نشانی قرار دیا ہے :-

جَعَلْنٰهَا وَ ابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء ۹۱ - ۲۱/۶) "اور اُس کو اور اُس کے بیٹے کو، دونوں کو ساری دُنیاؤں والوں کے لئے نشانی بنادیا"

ظاہر ہے کہ جب "حضرتِ مریم" کو بھی "نمونہ" اور "نشانی" بنایا گیا ہے تو "عورت" کی تجرد کی زندگی سے متذکرہ بالا خرابیوں کو منسوب کرنا کسی طرح درست نہیں مانا جاسکتا بالخصوص جبکہ قرآن نے عزیز مصر کی بیوی کی اہلی زندگی کا نقشہ بھی ساتھ ساتھ پیش کیا ہے سوچئے تو کہ قرآن نے تجرّد کی زندگی گذارنے والی مریم کا جو اعلیٰ کردار پیش کیا ہے وہ شادی شدہ عزیز مصر کی بیوی کی زندگی سے بہتر ہے یا بدتر؟ نیز آج جبکہ عورتیں تجرد کی زندگی گذار نہیں رہی ہیں تو کون سے یہ عیوب کم ہیں؟ سب سے قطع نظر سوال تو یہ ہے کہ جو خرابیاں مقصوّر ہیں، اُن کا ذمّہ دار فی الحقیقت مرد ہے یا عورت؟ اگر مرد ہی عورت کو بداخلاقی پر نہ اُبھارے اور نہ آمادہ کرے

تو عورت کی جانب سے وہ خرابیاں ظہور میں نہ آویں جن کا اندیشہ اوپر ظاہر کیا گیا ہے۔ اور اس کے لئے حضرتِ مریم کا، قرآن کا پیش کیا ہوا نمونہ، کافی و بس ہے۔ حضرتِ علامہ ابوالکلام آزاد نے غلط نہیں فرمایا ہے کہ :۔

"حقیقت یہ ہے کہ اگر پاکبازی و عصمت کے لحاظ سے دونوں جنسوں میں تفریق ہی کرنی ہو تو ہر طرح کی نفس پرستیوں اور بدکاریوں کی حیوانیت مرد کے حصہ میں آئے گی اور ہر طرح کی پاکیوں اور عفتوں کی فرشتگی عورت کے لئے ثابت ہوگی۔ یہ مرد ہی ہے جس کی حیوانیت پر عورت کی فرشتگی شاق گذرتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اُسے بھی اپنی ہی طرح کا حیوان بنادے، اس لئے اپنے کید عظیم کے سارے فتنے کام میں لاتا اور برائیوں کی ایک ایک راہ سے اُسے آشنا کرکے چھوڑتا ہے پھر جب وہ اُس کے پیچھے قدم اُٹھا دیتی ہے تو اُس سے گردن موڑ لیتا ہے اور کہنے لگتا ہے کہ اُس کا کید تو سب سے بڑا کید اور اُس کی بُرائی سب سے بڑی بُرائی ہے فی الحقیقت سب سے بڑا کید تو مرد ہی کا کید ہے جو پہلے اسے اپنی کا مجوئیوں کا آلہ بناتا ہے اور جب وہ بنجاتی ہے تو خود پاک بنا اور ساری ناپاکیوں کا بوجھ اُس معصوم کے سر ڈال دیتا ہے۔

دُنیا میں کوئی عورت بُری نہ ہوتی اگر مرد اُسے بُرا بننے پر مجبور نہ کرتا عورت کی بُرائی کتنی ہی سخت اور مکروہ صورت میں نمایاں ہوتی ہو لیکن اگر جستجو کروگے تو تہ میں ہمیشہ مرد ہی کا ہاتھ دکھائی دے گا اور اگر اُس کا ہاتھ نظر نہ آئے تو اُن برائیوں کا ہاتھ ضرور نظر آئے گا جو کسی نہ کسی شکل میں اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔"

بہرکیف! حضرتِ مریم کی مثال سامنے ہے لہذا یہ اندیشہ کہ اگر پیدائش کے معاملے

میں عورت، مرد کی محتاج نہ رہی یا عورت تجرّد کی زندگی گذارنے لگی تو معاشرت میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو جائیں گی، کسی طرح قابلِ اعتنا نہیں، اگر ایسا ہوتا تو قرآن اِس طریقِ پیدائش کو " اٰیۃً لِّلعٰلَمِیۡن " کبھی نہ بتاتا۔ نہ صرف اتنا بلکہ قرآن اِس سے آگے بڑھ کر اِس طریقِ پیدائش کو "رحمت" بتاتا ہے۔ غور فرمائیے اِس آیت پر:-

لِنَجۡعَلَہٗۤ اٰیَۃً لِّلنَّاسِ وَ رَحۡمَۃً مِّنَّا "تاکہ ہم اسے بنی نوعِ انسان کے لئے نشانی بنادیں اور اپنی طرف سے رحمت"۔ (مریم ۲- $\frac{19}{21}$)

یعنی از روئے قرآن:-

(۱) حضرتِ مریمؑ کا بے شوہر حاملہ ہونا اور بچہ جننا ساری دُنیاؤں والوں کے لئے ایک نمونہ، ایک سبق اور ایک نشانی ہے۔

(۲) حضرتِ عیسیٰؑ کا بغیر باپ کے پیدا ہونا ساری دُنیاؤں والوں کے لئے نشانی بھی ہے اور رحمت بھی۔

پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اگر ایسا ہوا تو یہ بہت ہی بُرا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ جس نے ہمیں پیدا کیا ہے وہ ہمارے بھلے اور بُرے کو ہم سے بہتر جانتا اور سمجھتا ہے۔ پھر وہ جس چیز کو "رحمت" بتائے، اُسے دوسرا کون ہے جو "زحمت" قرار دے؟

شاید بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت علّامہ اقبالؒ اِس طریقِ پیدائش کے خلاف تھے۔ یہ محض غلط فہمی ہے۔ علامہ موصوف کی " نظر[1]" سے قرآن کے نکتے اوجھل نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ ہرگز اِس طریقِ پیدائش کو بُرا نہیں سمجھتے تھے بلکہ عورتوں کی اِس روش کے خلاف تھے جو آجکل اولاد پیدا کرنے سے گریز کی

---

[1] قرآن میں "نظر" کرنے کا مطلب محض دیکھنا نہیں بلکہ غور و فکر اور تلاش و جستجو کی نگاہ سے دیکھنا ہے۔

شکل میں ظاہر ہو رہی ہے۔ یعنی وہ اولاد کی مصیبت مول لینا نہیں چاہتیں اور اِس اندازِ حیات کو علامہ موصوف غلط اور خلافِ قرآن قرار دیتے تھے۔ علّامہ موصوف نے "ماتا" یا مادرانہ محبت پر اسی لئے زور دیا ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت مریم کی ماتا پر اِس کا کوئی اثر نہیں پڑتا کہ اُن کا کوئی شوہر نہ تھا۔ علامہ کے نزدیک یہ چیز قابلِ اعتنا نہ تھی کہ عورتوں کو اُس طرح اولاد ہو جس طرح مریم کی ماں کو ہوئی تھی؟ یا اُس طرح ہو جس طرح مریم کو ہوئی تھی۔ موصوف صرف یہ چاہتے ہیں کہ عورت اولاد پیدا کرنے سے گریز نہ کرے اور باعصمت طور پر پیدا کرے اور ظاہر ہے کہ مریم کی عصمت پر شبہ کرنے والا کوئی مومن نہیں ہو سکتا۔



نسیم بک ڈپو لکھنؤ کی شائع کردہ چند منتخب کتابیں

خاتون	نسیم انہونوی (ناول)	7/-
ارمان	" "	5/-
طرز زندگی	" "	2/8
شبنم	" "	2/-
کہکشاں	" "	6/-
شوہر کا روگ	" "	1/4
شگفتہ	" "	3/-
نشاط	" "	4/8
[illegible] پارہ	" "	5/-
تن	" "	4/8
شبانہ	" "	5/-
بانو	" "	6/8
سراب زندگی	" "	4/-
مہتاب	" "	5/-
گرد	" "	4/-
آخری کہانی	" (افسانے)	2/-
[illegible]	"	2/-
چنبس	شوکت تھانوی (ناول)	2/-
[illegible] خاتون	"	2/-

کسک	مجاہد لکھنوی (ناول)	4/8
منزلیں	" "	3/-
تین چاند	" "	4/8
سہانے خواب	" "	4/4
ساحرہ کا انجام	" "	3/-
ہجرت	مائل نسیم آبادی (ناول)	3/8
کعبہ سے کربلا تک	" "	3/-
مرگ یزید	" "	2/8
نیزک طرخان	" (ناول)	3/8
پاسبان	" "	4/-
سکھ	" "	2/8
بازار	" "	3/-
آبرو	" "	1/8
نیا آدمی	" "	2/4
زیتون	" "	3/4
تیسری منزل	" "	3/-
یہ زندگی کے میلے	" "	2/8
نیل کی ساحرہ	منظر الحق (ناول)	4/-
لالۂ صحرا	" "	5/-